کے نام سے ہے، اور دوسرا "حکومتِ الٰہی یعنی دستور اساسی امامتِ امت" ہے، پہلے رسالہ میں انھوں نے دنیا کی حکومتوں کی تقسیم ان کے مختلف اعتبارات سے جداگانہ دکھائی ہے، اور دوسرے میں دکھایا ہے کہ رضائے الٰہی کے مطابق دنیاوی بادشاہت کن اصولوں اور قانون پر قائم کی جاسکتی ہے، چنانچہ مصنف نے دنیا کی موجودہ حکومتوں کے دستوروں کے مقابلہ میں "سماوی فطری نظامِ سلطنت" کا خاکہ کھینچا ہے، جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، اور اسے دفعہ وار تشریحی تعلیقات کے ساتھ درج کیا ہے، ان دونوں رسالوں کا اصلی مقصود یہ ہے، کہ مسلمان اسلام کی صحیح روحانی واخلاقی بنیادوں پر اپنی شیرازہ بندی کرکے اپنی اجتماعی زندگی کا مستقل نظام قائم کریں اور موجودہ دورِ ترقی میں اقوام وملل سے اپنی اجتماعی طاقت تسلیم کرائیں، دوسرے رسالہ پر افغانستان کے وزیر امورِ خارجہ آقائے فیض محمد خان صاحب نے تقریظ لکھی ہے جس میں اس رسالہ کو اسلامی علم اجتماع واسلامی حقوق کا رہنما بتایا ہے، اور رسالہ کو لائقِ درس وتدریس قرار دیا ہے،

نغمۂ کہسار، مرتبہ جناب سید تنویر علی صاحب معتمد بزم اردو، شملہ نمبر ۸، ٹوٹی کنڈی شملہ ۶۵ صفحے قیمت ۴ر

ہندوستانی زبان کے چند خدمتگزاروں نے شملہ میں "بزم اردو" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جو ادبی محفلوں اور مشاعروں کے ذریعہ سے اپنی زبان کی خدمت کرنا چاہتی ہے، اس بزم کا پہلا مشاعرہ ماہ ستمبر ۱۹۳۴ء میں آنریبل سید رضا علی صاحب کی صدارت میں ہوا، اور مرکزی حکومت ہند وحکومت پنجاب کے متعدد سربرآوردہ عہدہ داروں نے اس میں شریک ہوکر ہندوستانی زبان سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا، "نغمۂ کہسار" اسی مشاعرہ کی غزلوں اور اس کی روداد کا مجموعہ ہے، مشاعرہ میں مشاہیر شعراء، حسرت موہانی، اور جگر مرادآبادی وغیرہ کے علاوہ خاصی تعداد ہندو شعراء کی بھی تھی اسی طرح سامعین میں بھی ہندو اور سکھ بکثرت شریک تھے، اس طرح یہ صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان کا مشاعرہ تھا، خدا کرے، کہ یہ بزم قائم رہ کر ہندوستانی زبان کی مفید خدمات انجام دے، کہ اگر شملہ کی چوٹیوں پر بھی اس زبان کی آواز پہنچ جائے، تو اس کی ترقی کی بڑی امکانی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں،

"س"

جلد ۳۶ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۵ء | عدد ۶

مضامین

تاریخ صقلیہ جلد دوم

یہ سسلی کے اسلامی عہد کا تمدنی مرقع ہے، کتاب چند ابواب میں ہے، پہلے مسلمانان صقلیہ کے قبائلی حالات اسلامی آبادیاں، اسلامی عہد کی زبان، ادیان، مذاہب اور باشندوں کے اخلاق وعادات کا ذکر ہے، پھر نظام حکومت کی تفصیل ہے، جس میں اس کے مختلف شعبوں اور انکے اعمال کا ذکر ہے، پھر معاشی حالات کا بیان ہے، جس میں مسلمانوں کی صنعت وحرفت زراعت وتجارت کا بیان ہے، اسکے بعد علوم وآداب کا تذکرہ ہے، جس میں مختلف علوم قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، کلام، مناظرہ، شعر وشاعری علوم عقلیات، ریاضیات وطبعیات کا ذکر ایک ایک فصل میں ہے، اور انہی میں مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیہ، متکلمین، ادباء اور شعراء کے مفصل سوانح حیات انکی تصنیفات کا ذکر آیا ہے، آخری باب سسلی کے اسلامی تمدن سے یورپ کے استفادہ کے بیان میں ہے، کتاب چھپ چکی ہے، اور خریداروں کے لیے شائع ہو جائیگی

معذرت

افسوس کہ مولانا سید سلیمان ندوی ابھی تک بستر علالت ہی پر ہین، جس کی وجہ سے یہ پرچہ بھی شذرات کے صفحوں کے بغیر شائع کیا جارہا ہے،

"منیجر"

مقالات

سسلی مین مسلمانون کا تمدن

(۴)

از

سید ریاست علی ندوی،

علم ادب

اسلامی سسلی کی علمی ترقیوں میں علم ادب کو نمایاں جگہ حاصل ہے، تمام اصناف ادب شعروشاعری، انشا پردازی، اوران کے متعلقہ علوم عروض وقوافی اور نحو ولغت میں سیکڑوں ارباب کمال شعرا، انشا پرداز اور فن لغت ونحو ودیگر علوم کے ماہرین پیدا ہوئے،

اس علمی ترقی کا سب سے بڑا سبب وہی یہان کے حکمران طبقہ کا ذوقِ ادب تھا، فرمانروایانِ صقلیہ عہدہ دارانِ حکومت اور امرار ورؤسا خود علم ادب پر عبور رکھتے، اور ارباب ادب کے قدردان ہوتے، اس سے ملک میں ادب کے مذاق کو ترقی ہوئی، اور دوسرے ممالک کے شعرار حکمران طبقہ کی داد ودہش کے افسانے سنکر صقلیہ آتے، اور یہاں کی بزم علمی کی رونق بڑھاتے، یہی وجہ ہے کہ صقلیہ کے علوم دینیہ کے عالمین سے ارباب ادب کی تعداد کہیں زیادہ ہے، اور یہ صرف اسلامی دور پر موقوف نہیں، نارمن عہدِ حکومت میں بھی راجراول کے تعصب آمیز زمانہ کو خارج کرکے نارمن فرمانروایانِ صقلیہ اسلامی تہذیب و

تمدن سے اس درجہ مانوس ہوگئے کہ ان کے دربار مشرقی سلاطین کے درباروں کے مثل بن گئے، اور یہی صورتِ حال جرمن عہد میں بھی قائم رہی،

شاہی خانوادہ میں ذوقِ ادب

چنانچہ اغلبی عہد کے فرمانرواؤں میں عبداللہ بن محمد ابوالاغلب، اور اغلبی شہزادہ مجبر بن ابراہیم صقلیہ کے ممتاز شعراء میں ہیں، موخر الذکر مسینا اور جنوبی اٹلی کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا، رومیوں کے ہاتھ گرفتار ہوا، اور قفس ہی سے طائرِ روح پرواز کر گئی، وطن کی یاد میں اسکی ایک پر درد اور الم انگیز نظم قید خانہ کی سلاخوں سے نکل کر باہر پھیلی، اور افریقیہ اور صقلیہ تک پہنچی، اصفہانی نے یہ نظم نقل کی ہے،[1]

اسی طرح خانوادۂ کلبیہ میں ایسے کم فرمانروا گذرے ہیں، جو خود شاعر نہ ہوں، اور بعض کلبی شاہزادے بھی ممتاز شعراء میں تھے، اصفہانی وغیرہ نے ان کی شاعری کی ستائش کی ہے، اور نمونۂ کلام درج کیا ہے، انہیں سے چند یہ ہیں، (۱) امیر ابوالحسین احمد (۲) امیر ثقۃ الدولہ (۳) امیر تاج الدولہ (۴) ابوالقاسم عبداللہ بن الکلبی (۵) امیر ابومحمد عمار بن منصور الکلبی، (۶) امیر مستخلص الدولہ عبدالرحمٰن بن حسن کلبی (۷) امیر ابومحمد قاسم بن نزار الکلبی اور (۸) ابومحمد جعفر بن طیب الکلبی وغیرہ،[2]

عہدہ دارانِ حکومت میں ذوقِ ادب اور عہدہ دار شعراء

اسی طرح ذیل کے اکابر عہدہ دار اسلامی اور نارمن دوروں میں یہاں کے ممتاز شعراء میں ہیں، ابن القطاع اور اصفہانی نے توصیف کے ساتھ نمونۂ کلام درج کیا ہے، وہ یہ ہیں

(۱) القائد سند الدولہ ابوالفتوح بن قائد مدیر المکلاتی صاحب سلطان (۲) ابوالفضل احمد بن علی الفہری صاحب الشرطہ (۳) القائد ابومحمد حسن بن عمر بن منکود (۴) امیر شیخ الدولہ عبدالرحمٰن اللولو (۵) ابوعبداللہ حسن بن القائد (۶) ابوعبداللہ محمد بن الحسن بن الطوبی صاحب دیوان الانشاء والرسائل ہیں، ان کے تذکرے خریدۃ القصر (درا ماری ص ۵۹۹، ۵۹۵، ۵۹۶، ۶۰۴) اور مختصر انبار الرواۃ (درا ماری) میں آئے ہیں،

[1] مسالک الابصار ابن فضل اللہ درا ماری ص ۴۰۵، الحان المسلیہ در یادگاری ج ۱ ص ۲۹۲، خریدۃ القصر اصفہانی درا ماری ص ۵۹۲ تا ۵۹۹ و ابن خلکان ترجمہ یحییٰ بن اکثم،

اسی طرح تقریباً بیس اکیس کتاب و وزراء کے نام ملے ہیں، جو بلند پایہ انشاپرداز تھے، اور شاعری میں کمال رکھتے تھے، نیز کوئی نہ کوئی ان کی امتیازی خصوصیت تھی، مثلاً کوئی فنِ نحو کا امام تھا، کسی کو لغت پر عبور تھا، کوئی فنِ انشاء کے کمال کے ساتھ معمہ سازی و چیستاں نویسی میں مشہور تھا، کوئی مختلف صنعتوں کے استعمال پر قادر تھا، اور انہی میں بعض صاحبِ تصانیف و مقالات بھی تھے جنکو مورخین نے بیان کیا ہے،[1]

شعرائے دربار

شعراء کی ایک کثیر تعداد دربار سے بھی وابستہ تھی، جہاں وہ منہ مانگی مراد پاتے، اکثر مورخین نے تذکرہ کیا ہے، مثلاً تاج الدولہ کے متعلق ہے،

"یہ سخی اور مہربان فرمانروا تھا، علماء و شعراء ہر جگہ سے اس کے پاس آتے، ان کی قدرو منزلت کرتا، اور بخششوں سے مالامال کرتا"[2]

لیکن ان درباری شعراء کے صرف چند نام معلوم ہو سکے، مثلاً (۱) ابومحمد عبداللہ بن محمد المعروف بابن قاضی میلہ ثقۃ الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا، ابن خلکان نے اس کے بعض قصیدے اسکی شان میں نقل کئے ہیں، (ج ۲ ص ۱۸۲ تا ۱۸۵) (۲) محمد بن عبدون السوسی تاج الدولہ اس کے ایک ایک شعر پر زر و جواہر نثار کرتا،[3] (۳) ابن المودب القیروانی، ثقۃ الدولہ کے عہد میں آیا، اور قصیدہ پیش کیا،[4] (۴) ابوالحسن ابن الخیاط یعنی الصقلی تاج الدولہ کے دامن سے وابستہ تھا، دولتِ کلبیہ کے زوال کے بعد ابن ثمنہ کی مدح سرائی کی،[5]

اربابِ علم ادب و شعر

صقلیہ کے اربابِ علم ادب و شعر کے دو دور سہولت کے لئے قائم کئے جا سکتے ہیں، یعنی دورِ اول عہد اسلامی، اور دورِ ثانی عہد عیسوی، اور پھر ہر دور میں دو قسم کے اربابِ ادب لائے جا سکتے ہیں، یعنی وہ ادباء جو اصنافِ ادب و متعلقات مثلاً انشاء، نحو، لغت، اور عروض وغیرہ میں صاحبِ کمال ہیں،

[1] الاکحان المسلیہ در یادگاری ج ۱ ص ۲۹۵، ۲۹۶، خریدۃ القصر درا ماری ص ۵۸۹ تا ۵۹۰، ۶۰۱، ۶۰۴ و کتاب انبار الرواۃ درا ماری ص ۶۴۷ وغیرہ، [2] رحلۃ التیجانی درا ماری ص ۲۷۹، [3] ابن خلکان ج ۳ ص ترجمہ یحییٰ بن اکثم۔ [4] الاکحان المسلیہ در یادگاری ج ۱ ص ۲۹۸،

عام ازیں کہ وہ شاعر بھی ہوں، اور دوسرے وہ اربابِ ذوق ہیں، جنھیں مورخین نے صرف شاعر ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے،

دورِ اول یعنی عہدِ اسلامی کے ادبار

اس طرح اگر دورِ اول یعنی عہد اسلامی کے ادبا کو دیکھا جائے، تو ان کی تعداد ذکر کو بالا اربابِ علم کو چھوڑ کر، ۲ ہوتی ہے، جنھیں مورخین نے علم ادب کے ماہرین کی حیثیت سے جگہ دی ہے، کسی کو ماہرِ لغت، کسی کو امام علوم آداب، کسی کو علم نحو میں یکتائے زمانہ کہا ہے، اور کسی کو عروضی کا خطاب دیا، ان اربابِ ادب میں چند صاحبِ تالیف بھی تھے، مثلاً عثمان بن علی السرقوسی اللغوی النحوی کی علم نحو وغیرہ میں کتابیں تھیں[۱]۔ ابو حفص عمر بن خلف بن مکی الصقلی الخطیب اللغوی النحوی کے خطبات مدون ہوے، قفطی نے ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ[۵] جیسے بلند پایہ ادیب پر اس کو ترجیح دی، فنِ لغت میں اس کی ایک کتاب تثقیف اللسان ہے، جو امام نووی کی کتاب تہذیب الاسمار کے ماخذوں میں ہے، کشف الظنون میں اُسکا نام سقیف اللسان چھپ گیا ہے[۲]،

ابو الحسن علی بن عبد الرحمٰن بن ابی بشار الصقلی کو اسکندریہ میں امام نحو تسلیم کیا جاتا تھا، اس کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ مرتب تھا[۳]، ابن فہام الصقلی النحوی کی نحو میں تالیفات ہیں[۴]، ابو عمران موسیٰ بن اصبغ القرطبی اللغوی الادیب متوطن صقلیہ نے آٹھ ہزار اشعار کے مجموعہ میں نحو کے مسائل مبتدیوں کے لئے منضبط کئے[۵]، ابن رشیق القیروانی متوطن صقلیہ کی ذیل کی چند کتابیں صقلیہ میں تالیف پائیں، کتاب الشذور فی اللغة، میزان العمل، الروضة الموشیہ، کتاب المساوی، انموذج اللغة اور دیوان ابن رشیق چند قصیدوں اور نظموں

[۱] بغیة الوعاة ص ۳۲۳، کتاب المقفی مقریزی در اماری ص ۶۶۳، [۲] بغیة الوعاة سیوطی ص ۳۶۱ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰، خریدة القصر در اماری ص ۵۹۰، کتاب انباہ الرواة در اماری ص ۶۴۲، [۳] اخبار الملوک و نزہة المالک والمملوک فی طبقات الشعراء المتقدمین در اماری ص ۶۱۲، کتاب انباہ الرواة در اماری ص ۶۴۴، خریدة القصر ص ۵۷۹، ۵۸۰، معجم البلدان ذکر بلنوبہ در صقلیہ، [۴] مختصر انباہ الرواة در اماری ص ۶۴۵، [۵] بغیة الوعاة ص ۴۲۶،

کا مقام نظم بھی متحقق طور پر صقلیہ ہے[۱]، عمر بن علی بن عمر السرقوسی کی نحو، لغت، اور عروض میں کتابیں تھیں[۲]،

ادبائے متقدمین کا خاتمہ ابن القطاع، ابو القاسم علی بن جعفر (محمد بن علی) الصقلی النحوی اللغوی الادیب متوفی ۵۱۵ھ پر ہوتا ہے، جس نے اپنی تالیف سے جزیرہ کے بکثرت شعراء کو زندہ جاوید بنا دیا، ۴۳۳ھ میں صقلیہ میں پیدا ہوا، یہیں تعلیم و تربیت پائی، اور یہیں فضیلت علمی کے بلند درجہ پر فائز ہوا، یاقوت لکھتا ہے، "یہ اپنے وقت میں اپنے وطن، اور مصر میں علم عربی اور فنون ادب کا امام تھا[۳]"

علوم ادب میں اسکی ذیل کی کتابیں ہیں، حواشی بر صحاح جوہری، صحاح کے مشہور محشی ابو محمد بن بری النحوی کے حواشی کی بنیاد ابن القطاع کے انہی حواشی پر ہے[۴]، کتاب الافعال، در سہ جلد، ابن القوطیہ اور ابن طریف کی کتاب الافعال میں اصلاح و تہذیب کے بعد اس کو مرتب کیا، ابن خلکان کہتا ہے، "ابن القوطیہ کی کتاب الافعال سے بہتر ہے"، چند نسخوں کا پتہ چلا ہے، ایک رامپور کے کتبخانہ میں، ابنیة الافعال والاسماء والمصادر کے نام سے ۵۸۱ھ کا مکتوب ہے، دوسرا نسخہ میلان اور تیسرا اسکوریال میں ہے، میلان کے نسخے سے گریفینی نے چند اقتباسات شائع کئے ہیں[۵]، کتاب الاسماء اس میں اسماء کے اوزان و ابنیہ جمع کئے ہیں، ابن خلکان کہتا ہے، "اس سے اس کی کثرتِ اطلاع کا ثبوت ملتا ہے[۶]"، کتاب الابنیہ کا حاجی خلیفہ نے ذکر کیا ہے، جس میں افعال و اسماء دونوں کے اوزان مشترک درج ہیں[۷]، عجب کیا ہے، کہ رامپور کے کتب خانہ میں اسی کا نسخہ ہو، نام سے اشتباہ ہوتا ہے، کتاب السیف، تلوار کے اسماء و صفات کے بیان میں (کشف الظنون) کتاب القصار و اسمائہم وصفاتہم دھوبیوں کے اسماء و صفات میں (کشف الظنون) کتاب العروض والقوافی اور کتاب فرائد الشذور و

[۱] معارف ج ۲۲، [۲] و ج ۴۲ء ۱-۳، [۳] مختصر انباہ الرواة در اماری ص ۶۴۶، [۴] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰ معجم الادباء ج ۵ ص ۱۰۷، خریدة القصر در اماری ص ۵۸۹ بغیة الوعاة ص ۳۳۲، [۴] معجم الادباء ج ۶ ص ۱۴۳، ج ۵ ص ۱۰۰، [۵] فہرست کتبخانہ رام پور و مقالہ گریفینی در یادگاری ج ۱ ص ۴۳۲، [۶] ج ۲، ص ۲۰ و معجم الادباء ج ۵ ص ۱۰۶، [۷] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۸۳،

قلائد النحور، شعروشاعری میں ہے، یاقوت نے تذکرہ کیا ہے[۱]،

اور اس دور کے بقیہ ادبار کے تذکرے ذیل کے مقامات میں دیکھئے، عیون الانبار فی طبقات الاطبا (ج اص ۱۸۹) بغیۃ الوعاۃ (ص ۲۲۴، ۲۵۶،۷۵، ۶۴، ۳۳۲،۲۲۵) کتاب انبار الرواۃ (در اماری ص ۶۴۵، ۶۴۰،۶۴۶) ابن عساکر (ستہ ۳۹۱ھ) الوافی بالوفیات (در اماری) ابن خلکان (تذکرہ ابو العلار، صاعد، ابوطاہر اسمعیل) خریدۃ القصر (در اماری ص ۵۷۹، ۵۸۰، ۶۰۳) ترتیب المدارک (در یادگاری ج اص ۳۸۲، ۳۷۶) معجم الادبار (ج ۵ ص ۱۱۵) الالحان المسلیہ (در یادگاری ج اص ۲۹۷-۳۰۳)

شعرائے متقدمین — عہد اسلامی کے شعرار کے ۳۶ نام ایسے معلوم ہو سکے ہیں، جن کے شعروشاعری کی ارباب تذکرہ نے مدح سرائی کی ہے، اور نمونۂ کلام درج کیا ہے، اور جن شعرار کو اصناف شاعری میں سے کسی خاص صنف میں شہرت تھی، یا کوئی خاص کمال حاصل تھا، اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے، ان شعرار کے تذکرے کتاب الالحان المسلیہ (در یادگاری ج اص ۲۹۹، ۳۰۴، ۲۹۸، ۲۹۷) خریدۃ القصر (در اماری ص ۵۸۹، ۶۱۰، ۶۰۳، ۵۸۱، ۶۰۱، ۵۹۸) اور ترتیب المدارک (در یادگاری ج اص ۲۸۲) میں آئے ہیں،

اس دور میں بعض شعرار صاحب دیوان بھی گذرے ہیں، جن میں ایک ابو العرب مصعب الصقلی (موجود ۴۸۰ھ) ہے، تذکرہ نگاروں نے اس کو صقلیہ کے ممتاز ترین شعرار میں جگہ دی ہے، صقلیہ میں اس سے شعروشاعری کا بازار گرم تھا، المعتمد نے اس کو اشبیلیہ آنے کی دعوت دی، مگر وطن چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا، آخر نارمنی فتنہ سے گھبرا کر ۴۶۵ھ میں وطن کو خیرباد کہہ دینے پر مجبور ہوا، اور المعتمد کے دربار سے وابستہ ہوگیا، حاجی خلیفہ نے اس کے دیوان کا تذکرہ کیا ہے[۳]،

اس دور کا خاتمہ صقلیہ کے مشہور شاعر ابن حمدیس السرقوسی، ابو محمد عبد الجبار بن ابوبکر الازدی پر ہوتا ہے

[۱] معجم الادبار ج ۵ ص ۱۰۰ [۲] ابن خلکان ج ۲ ص ۲، مسالک الابصار در اماری ص ۶۵۵، ۶۵۶، الالحان المسلیہ در یادگاری ج اص ۲۹۶، نفح الطیب [۳] کشف الظنون ج اص ۵۲۳،

(۴۴۷ھ - ۵۲۷ھ) عربی علم ادب وشعر میں پانچویں صدی کے ممتاز وباکمال اساتذۂ فن شعرا میں گذرا ہے، جس کی شاعری کا غلغلہ مغرب سے مشرق تک بلند ہوا، اور اس کے ہمعصر ناقدین فن نے فن شعر میں اس کی فضیلت و برتری کا اعتراف کیا[۱]،

ابن حمدیس کا جب آفتاب کمال طلوع ہوا، تو اسلامی صقلیہ اجڑ چکا تھا، اپنے بوڑھے باپ کو صقلیہ میں چھوڑ کر صقلیہ سے نکل پڑا، اور مختلف جگہ ہوتا ہوا اشبیلیہ میں المعتمد کے دربار سے وابستہ ہوگیا، اس کی شاعری کا بڑا حصہ اسی دربار کی قصیدہ خوانی میں ہے، اور کچھ حصہ وطن کی یاد میں ہے،

اپنا دیوان خود مرتب کیا تھا، جو دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے، پہلی مرتبہ تاریخ صقلیہ کے محسن اماری نے ۱۸۸۳ء میں پلرمو سے شائع کیا، پھر ۱۸۹۷ء میں روم سے دوسرا اڈیشن نکلا[۲]،

ابن حمدیس کی شاعری کا صحیح اندازہ اس کے نمونۂ کلام سے ہو سکتا ہے، جس کی یہاں گنجایش نہیں، تاہم یہ دیکھا جا سکتا ہے، کہ اس کے خیالات کی بلندی، معانی کی وسعت، کلام کے زور، عربی زبان پر قدرت، الفاظ کے شکوہ، فقروں میں در و بست، بندش کی دلفریب چستی، تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت سے عربی علم ادب کے ناقدین اسکی طرف متوجہ ہوئے، اور جب اس کی شاعری پر نقد کرنے لگے، اور کلام کے نمونے سامنے آئے، تو ناقدین ادب کی تنقیدیں بھی شاعرانہ طرز ادا، ندرت تشبیہ، اور لطف استعارات کے ساتھ قلمبند ہوئیں، المنصور شاہ حماۃ لکھتا ہے:-

" وہ یگانۂ دہر تھا، علمی گھوڑ دوڑ اور بزم و رزم کے میدان میں اس کا مقابلہ ممکن نہیں، علم و حکمت

[۱] ابن خلکان ج اص ۳۴۲، ۵، التکملہ ابن الابار ص ۶۳۷، المعجب مراکشی ص ۱۷ تا ۱۰۴ کتاب الذخیرہ ابن بسام در تاریخ بنی عباد ڈوزی ج ۳ ص ۴۵ الالحان المسلیہ در یادگاری ج اص ۲۹۹ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۲۹، ۵۳۰، ۴۵۱ وغیرہ و انتخاب دیوان حمدیس در اماری، [۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تذکرہ ابن حمدیس، و یادگاری مضامین ج اص ۳۰۴،

کی اشاعت میں کوئی اس کی گرد کو نہیں پہنچا، علماء، فضلاء کے درمیان نہایت مشہور تھا، کہ ایک
بہترین قادر الکلام شاعر تھا[۱]

ابن فضل اللہ العمری کا بیان ہے،

"وہ ایک ایسی صبح ہے جس کو تاریکیاں زنگ آلود نہیں کرتیں، اور ایسا خالص پانی ہے جسکو
گندگیاں گدلا نہیں کرتیں، وہ ایسا اسپ اصیل ہے جس کے پاس بھی آگے بڑھنے والے
گھوڑے نہیں پھٹک سکتے، ایک ایسا بادل ہے جس کو بجلیاں حرکت میں نہیں لاسکتیں،
اس کی بار آور شاخ ٹوٹ نہیں سکتی، اس کی شب ماہ اندھیری نہیں ہوسکتی، اس کے راستہ
پر بہت کم لوگ چلے ہیں، اس کے آسمان پر جن لوگوں نے اپنے روشن چاند منور کئے، وہ شاذ ہیں[۲]

اس کے بعد کتاب الذخیرہ ابن بسام سے اس کے متعلق ذیل کی رائے نقل کرتا ہے:-

"وہ ایک ایسا ماہر شاعر ہے، جو نادر معانی کی چاندماری پر نشانہ لگاتا ہے، نہایت مناسب
تشبیہات کے استعمال پر قادر ہے، اور الفاظ کے دریا میں غوطہ لگا کر نادر معانی کے موتی رولتا ہے[۳]

اسی طرح ابن خلکان اور ابن الآبار وغیرہ اس کی شاعری پر تقریباً اسی طرح رائے ظاہر کرتے ہیں[۴]

دور ثانی
عیسوی عہد حکومت کے مسلمان ادباء و شعراء

صقلیہ میں دولت اسلامی کے خاتمہ کے بعد راجر اول کے عہد حکومت تک مسلمانان صقلیہ
پر عام دور ابتلا رہا، ادباء و شعراء بھی اس کے پنجہ ظلم سے نہ بچ سکے، ابوحفص عمر بن حسن الصقلی
اسی عہد میں قید خانہ میں ڈال دیا گیا، اس نے راجر کے پاس چند قصائد بھیجے، مگر وہ ان لطافتوں سے آگاہ
نہ تھا، اسے رہائی نصیب نہیں ہوئی،

لیکن راجر دوم کی پرورش صقلیہ کے اسلامی آب و ہوا میں ہوئی، اور وہ اسلامی تہذیب و تمدن

[۱] اخبار الملوک و نزہۃ المالک والملوک در اماری ص ۶۱۲ [۲] کتاب مسالک الابصار در اماری ص ۶۵۳، [۳] ابن خلکان ج ا ص ۴۹۵، [۴] التکملہ ابن الآبار ص ۶۴۰، [۵] خریدۃ القصر در اماری ص ۵۰۰، مختصر انباء الرواۃ در اماری ص ۶۴۷،

کا دلدادہ بنگیا، زبان عربی پر کامل قدرت حاصل کی، دفتری زبان عربی ہی رہی، سکہ پر عربی حروف کندہ تھے
القاب و خطابات عربی تھے، طرز معاشرت اور طریق حکومت بھی اسلامی ہی تھا، اس لئے قدرةً عرب شعراء
کی قدردانی کا وقت بھی آپہنچا جس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ جرمن فرمانروا مینفرید کے عہد (۶۶۵ھ ۱۲۶۶ء) تک قائم رہا،
چنانچہ پاپائے روما اور بعض یورپین مورخین کی اصطلاح میں بعض حیثیات سے یہ پورا دور بھی گویا صقلیہ کا
اسلامی دور ہے[۱] اسی کا اثر تھا کہ اگر راجر اول نے ایک عرب شاعر کو قید خانہ میں ڈال دیا، تو راجر دوم ایک
دوسرے عرب شاعر کو صرف ایک قصیدہ کے صلہ میں نہ صرف قید سے رہا کرتا ہے، بلکہ انعام و اکرام سے سرفراز
کرتا ہے[۲] اور نفس قصیدہ گوئی اس درجہ موثر تصور کی جاتی ہے، کہ یحییٰ بن تیفاسی القفصی نارمن حکومت کے ایک
دشمن حکومت کا قصیدہ خوان جب اتفاقاً گرفتار ہوتا ہے، تو صرف اسی قصیدہ خوانی کے جرم میں تہ تیغ کر دیا جاتا ہے[۳]
چنانچہ نارمن دربار میں بھی شعر و شاعری کا وہی غلغلہ سنائی دینے لگتا ہے، جو اس سے چند دن پہلے
بلرم کے قصر میں بلند تھا، اور اس کی آواز بازگشت بھی ابھی خاموش نہیں ہوئی تھی، نارمن دربار کے شعراء میں
(۱) عبد الرحمن بن محمد بن عمر البثیری، (۲) ابن بشرون الصقلی، (۳) قاضی عبد الرحمن بن رمضان اور (۴)
ابوالضیاء سراج بن احمد بن رجاء الصقلی وغیرہ ہیں، جن کے قصائد بھی نارمن فرمانرواؤں کی شان میں تذکرۂ
شعراء میں منقول ہیں[۴] شریف ادریسی بھی اسی دربار سے وابستہ تھا، اگرچہ اسکی شہرت علم جغرافیہ میں ہے، مگر وہ
ایک مخصوص طرز انشاء کا مالک بھی سمجھا جاتا ہے، ابن بشرون نے اس کے انشاء پر تبصرہ کیا ہے[۵]

چھٹی ساتویں صدی کے ادباء لغویین، وعلماء نحو، اور شعراء میں گیارہ اہل علم کے نام نظر آتے ہیں
جن کے تذکرے انباء الرواۃ (در اماری ص ۶۴۵) الالحان المسلسلہ (در یادگاری ج ا ص ۳۰۰) عنوان

[۱] ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۹ ص ۸۱، انسائیکلوپیڈیا برطانیکا ج ۲۰ ص ۱۶۷ (ولیم) وص ۱۰۲ ج ۱۱ ص
[۲] مسالک الابصار در اماری ص ۱۵۲، [۳] خریدۃ القصر در اماری ص ۵۹۹، [۴] خریدۃ القصر در اماری ص
۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۱، ۶۰۱، [۵] خریدۃ القصر در اماری ص ۶۱۱، والوافی بالوفیات صفدی ج ۱ ص ۱۶۳

(ص ۱۲۱، ۱۶۹) خریدۃ القصر (در اماری ص ۶۰۴، ۶۰۶) ابن خلکان (جلد ۳ ص ۶۳) اور مقالہ حسن حسنی عبدالوہاب (در یادگاری ج ۲ ص ۴۹۲) میں آئے ہیں، اسی دور میں امام مازری کی بھی چند ادبی کتابیں ہیں، جن کا تذکرہ ابن خلکان نے کیا ہے، (ج ۲ ص ۲۸۷) اور ابن ظفر الصقلی کا مشہور ادبی شاہکار سلوان المطاع فی عدوان الاطباع بھی اسی دور میں صقلیہ میں مرتب ہوا، جو ایک صقلی مسلمان قائد کے تعمیل حکم میں لکھا گیا، اس کتاب کے نسخے پیرس اور اکسفورڈ میں موجود ہیں، لیکن دونوں میں کسی قدر فرق بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابن ظفر نے بعد میں اسکے دیباچہ میں کچھ رد و بدل کیا، اکسفورڈ کا نسخہ اسی کتاب کا ہے، جو صقلیہ میں اولاً تالیف ہوئی، سلوان المطاع کا طرز تحریر مقامات حریری کے طرز پر اور طرز بیان و واقعات کلیلہ دمنہ کے طرز پر ہیں، مصنف نے اس کے آخر میں دو جزوں کا ایک ضمیمہ بھی منسلک کیا ہے،

صقلیہ کا یہ علمی تحفہ عالم اسلامی میں مقبول ہوا، اولاً تاج الدین ابو عبداللہ بن النجاری متوفی ۷۹۹ھ نے اسکو عربی نظم میں منتقل کیا، ایک دوسرے اہل علم نے اسکی حکایتوں کو کسی قدر مقدم و موخر کر کے فارسی میں ریاض الملوک فی ریاض السلوک کے نام سے موسوم کیا، ترکی میں شیخ الاسلام محمد امین (۱۰۶۷ھ) نے ترجمہ کیا، پھر مائکل اماری نے ایطالوی ترجمہ ۱۸۵۱ء میں شائع کیا، اور اصل کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۲۷۸ھ میں مصر سے پھر ۱۲۷۹ھ میں تونس سے اور آخر میں بیروت سے شائع ہوا،

ابن ظفر کی چند اور ادبی کتابیں ہیں جنکے موضوع و مبحث کی تفصیل انھوں نے خود الگ الگ بیان کی ہے، وہ کتابیں حسب ذیل ہیں، ملح اللغۃ، کتاب السفر، کتاب التعقیب، کتاب اوہام الخواص، کتاب کشف الکشف، کتاب الجود والعواقب، کتاب الخوذ الواقیہ والعوذ الراقیہ، کتاب ریاض الذکری، کتاب النصائح، کتاب مالک الاذکار فی مسالک الافکار، کتاب الفوائد والبیان فی النحو،[1]

ابن ظفر ایک قادر الکلام انشا پرداز تھے، عربی لغت و ادب پر وسیع نگاہ تھی، اور اس دور میں عربی ادب میں جو مقفی و مسجع عبارت آرائی تھی، اسمیں کمال سمجھے جاتے تھے، اسلوب بیان، طرز تحریر اور طریق انشا وہی ہے جو چھٹی صدی میں عام بلند پایہ عرب ادبا کے درمیان رائج تھا،

---

[1] اقتباس سلوان المطاع در اماری ص ۶۶۰ تا ص ۶۹۱ کتاب المقفی مقریزی در اماری ص ۶۷۶، کشف الظنون ج ۲ ص ۳۱، الکتفاء و القنوع بما ہو المطبوع ص ۳۰۸،

علوم عقلیات و ریاضیات و طبعیات

علوم و فنون کے بیان کی ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مسلمانان صقلیہ کو ان علوم کی جانب توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، تاہم کچھ نشانات مل جاتے ہیں،

طب، مسلمانوں نے صدر اول کے خاتمہ یعنی علوم اسلامیہ کی تدوین کے بعد سب سے پہلے علم طب پر توجہ کی چنانچہ صقلیہ میں بھی کسی قدر اسی میں رونق نظر آتی ہے، اور صقلیہ کے چند اطبا اور ان کی تالیفات کا پتہ چلتا ہے،

صقلیہ کے اطبا نے طب کی جو مستقل خدمت انجام دی، ان میں اندلس میں عبدالرحمن الناصر کے عہد میں ابن جلجل ابو داؤد سلیمان کی نگرانی میں ایک طبی ادارہ میں بعض طبی خدمات انجام دینا ہے، اطبا کی ایک جماعت اس ادارہ میں طبی تحقیقات میں مصروف تھی، طب یونانی کی اصطلاحوں اور دواؤں کے نام عربی میں منتقل کر رہی تھی، اس ادارہ میں ایک صقلی طبیب ابو عبداللہ بھی تھا، جو عبدالرحمن الناصر کے عہد سے المستنصر کے زمانہ تک اس سے وابستہ رہا،[1]

صقلیہ کے اطبا نے طب میں جو کتابیں لکھیں، ان میں سے چند کا پتہ دور حاضر میں چلا ہے وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ ابو سعید بن ابراہیم الطبیب الصقلی کی ایک کتاب النجح فی التداوی من صنوف الامراض والشکاوی کے دو نسخے بوڈلین اور پیرس کے کتب خانوں میں ہیں، اماری نے اپنے مجموعہ میں کچھ اقتباسات نقل کئے ہیں (ص ۶۹۴) مصنف کے زمانہ کا پتہ نہیں، تاہم اسکی اس کتاب کے دیباچہ کی نوعیت سے اس کا زمانہ قدیم معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف سے پہلے طب میں جسقدر کتابیں ہیں، ان میں یا تو مفرد دواؤں کے خواص ہیں، یا ایسی کتابیں ہیں جن میں مختلف امراض کا علاج مفردات سے بتایا گیا ہے، مصنف اپنے بیان کے مطابق وہ پہلا شخص ہے، جس نے ان دونوں امور کو اس تالیف میں جمع کیا،

---

[1] عیون الانبا فی طبقات الاطبا، جلد ۲ ص ۴۶،

۲۔ صقلیہ کے مشہور محدث امام مازری علم طب میں بھی کمال رکھتے تھے، ابن فرحون کا بیان ہے "جس طرح فقہ میں لوگ انکی طرف رجوع کرتے ہیں، اسی طرح طب میں بھی خلائق کے مرجوعہ ہیں"[1]

۳۔ شیخ ابوبکر الصقلی الطبیب کیلئے یہ باعثِ فخر ہے، کہ شیخ عز الدین جو بیمارستان نوری دمشق کے طبیب حاذق تھے، اور ابن ابی اصیبعہ جو عیون الانبا فی طبقات الاطبا، کا مصنف ہے، دونوں انہی کے تلامذہ میں تھے،[2]

اطبائے صقلیہ کا ایک خاندان، اسی طرح اطبائے صقلیہ کا ایک خاندان صقلیہ سے ہجرت کرکے افریقہ آیا، اور مراکش کے فرمانروا ابوالفارس عبد العزیز بن ابی الحسن کے دربار سے وابستہ ہوگیا، اس خاندان میں حاذق اطبا گذرے ہیں، جنھوں نے طب میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں، (۴) ابومحمد عبد السلام بن ابراہیم الصقلی الطبیب متوفی ۸۲۲ھ وہ پہلے طبیب ہیں، جو اس خاندان کے افریقہ میں آئے، انکی ایک کتاب فن جراحت میں ہے جس کا ایک نسخہ جامع زیتون ٹونس میں موجود ہے، (۵) ابوالعباس احمد بن عبد السلام الشریف الصقلی الطبیب کی دو کتابیں معلوم ہیں، شرح ارجوزہ لابن سینا اس کا ایک نسخہ مدرسہ صادقیہ ٹونس کے طلبائے قدیم کی ایسوسی ایشن میں ۸۷۱ھ کا مکتوب موجود ہے، کتاب الاطبار فی الامراض من الفرق الی القدم اس میں سر سے پیر تک کے تمام اعضار کے امراض و علاج کو بیان کیا ہے، اسکے دو نسخے ہیں، ایک لیڈن میں، دوسرا ٹونس میں، (۶) ابوعبد اللہ محمد بن عثمان الطبیب الصقلی کی بھی دو کتابیں ہیں، المختصر الفارسی جو امام رازی کے اتباع میں المنصوری کی طرح ابوالفارس کی طرف منسوب ہے، اس میں طب کو دو قسموں علمی و عملی علم بالکلیات و عمل بالمعالجات میں تقسیم کرکے اول کو تین مقالوں اور دوسرے کو ت مقالوں میں بیان کیا ہے، اسکے کئی نسخے جامع زیتون ٹونس میں موجود ہیں، کتاب منہاج الدکان کا ایک نسخہ جامع زیتون میں ۱۱۶۲ھ کا مکتوب ہے[3]

[1] دیباج جلد ۱ ص ۲۸۰، ابن فرحون [2] عیون الانبا، جلد ۱ ص ۲۷۶ [3] مقالہ حسن حسنی عبد الوہاب در یادگاری، جلد ۲ ص ۴۰۶ تا ۴۱۹، و مقالہ گریفینی جلد ۱ ص ۴۴۵ و جلد تحمیکا اماری ص ۶۵۶،

نارمن دربار میں عرب و یہودی دونوں طبیب تھے، ابن جبیر ولیم ثانی کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ اطبار کا نہایت حریص ہے، اپنے پاس سے جدا ہونے نہیں دیتا،[1] اور یورپ کے ایک عجائب خانہ میں ولیم ثانی کی ایک تصویر ہے، جس میں ایک عرب طبیب ولیم کے بستر موت کے سامنے اپنے آلات رکھے عمل جراحی کر رہا ہے، یہ تصویر العلال والقطعف میں نظر آئی تھی

علم جغرافیہ

علم جغرافیہ سے صقلیہ کے اہل علم کی دلچسپی کا اندازہ ان روایتوں سے ہوتا ہے، جو صقلی اہل علم جغرافیہ نویسوں سے صقلیہ کے متعلق جغرافی حالات بیان کیا کرتے تھے، اور ان کے حوالے جغرافیہ کی بعض کتابوں میں درج ہوگئے ہیں،[2] اسی طرح یہ بھی معلوم ہے، کہ اسوقت تک علم جغرافیہ میں جو کتابیں تالیف ہوئی تھیں، وہ صقلیہ کے اہل علم میں متداول تھیں، ادریسی نے صقلیہ میں انکے موجود ہونے کا تذکرہ نام بنام کیا ہے،[3]

مشہور عرب سیاح صقلیہ میں، مشہور عرب سیاحوں میں ابن حوقل اور ابن جبیر صقلیہ آئے، اور اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا، اور ابن حوقل نے اپنے سفرنامہ میں صقلیہ کے تذکرہ کے علاوہ بلرم کے حالات میں ایک مستقل رسالہ لکھا، جو ۱۸۴۵ء میں پیرس سے طبع ہو چکا ہے، (الکتفار القنوع) لیکن میری نظر سے نہیں گذرا، اس کے ایک رسالہ کا تذکرہ محاسن اہل صقلیہ کے نام سے معجم البلدان (جلد ۵ ص ۲۰۶) میں آیا ہے، شاید مطبوعہ رسالہ یہی ہو، ابن جبیر ۵۸۰ھ میں یہاں آیا، اور دو مہینہ سے زیادہ مقیم رہا، صقلیہ کے مسلمانوں سے اس کے مراسم قائم ہوئے، اسکے سفرنامہ کا سب سے پہلا حصہ صقلیہ ہی کے متعلق ۱۸۴۶ء میں فرانسیسی ترجمہ کیساتھ شائع ہوا، پھر پورا سفرنامہ ۱۸۵۲ء میں پھر ۱۸۹۶ء اور آخر میں ۱۹۰۷ء میں گب میموریل کی جانب سے اہتمام سے چھپا،

عرب جغرافیہ نویسوں میں ابوعبد اللہ محمد بن محمد المعروف بالشریف ادریسی کا نام اسلامی علم جغرافیہ کی تاریخ

[1] رحلۃ ابن جبیر ذکر صقلیہ، [2] کتاب تحفۃ الالباب ونخبۃ الاعجاب در اماری ص ۴۸، کتاب الاشارات فی معرفۃ الزیارات در اماری [3] معجم البلدان جلد ۵ ص ۲۰۵، [4] نزہۃ المشتاق ص ۵،

میں زریں حروف میں لکھا جائے گا، اسے علوم عقلیہ میں دستگاہ کامل تھی، اور اسی تعلق سے صقلیہ آیا، راجر دوم
نے قدر افزائی کی، اور اپنی شہرۂ آفاق کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق راجر ہی کے لئے تالیف کی،
جو یورپ کے مختلف کتب خانوں پیرس آکسفورڈ، اور قسطنطنیہ وغیرہ میں محفوظ ہے، اسکے شائع شدہ حصص میں
اولاً ۱۵۹۲ء میں اسی کا ایک عربی اختصار روم سے نکلا، پھر مختلف مستشرقین کے اہتمام میں مختلف حصے مختلف
وقتوں میں شائع ہوئے، جن میں سے پہلا حصہ شام و فلسطین کے متعلق ۱۸۲۸ء میں، پھر مغرب، سوڈان، مصر
اور اندلس کے حصہ کو ڈوزی نے ۱۸۶۴ء میں لیڈن سے چھاپا، اسکے بعد ۱۸۸۵ء میں ایطالوی ترجمہ کے ساتھ
ایطالیہ و صقلیہ کے حالات چھپے، اور اسی طرح اس کے مختلف ترجمے کہیں مع اصل، کہیں صرف ترجمہ مختلف مقامات
سے شائع ہوئے،

شریف ادریسی راجر دوم (۵۴۹ھ ۱۱۵۴ء) کی وفات کے بعد بھی یہیں مقیم رہا، ولیم (۵۶۱ھ ۱۱۶۶ء - ۵۸۵ھ ۱۱۸۹ء)
نے بھی اسکی قدر کی، اور اس کے نام پر بھی جغرافیہ میں ایک کتاب روض الانس و نزہتہ النفس کے نام سے
لکھی، جو اصفہانی کے بیان کے مطابق نزہتہ المشتاق سے زیادہ ضخیم تھی، چند سال گذرے اس کے
ایک مختصر حصہ کا پتہ قسطنطنیہ کے ایک کتب خانہ میں چلا ہے[1]،

علم ہیئت و ریاضیات

علم ہیئت عربوں کا محبوب فن رہا ہے، جہاں رہے، فلک پیمائی کرتے نظر آئے، ادریسی کا وہ کرہ
لائق ذکر ہے، جو یہاں تیار ہوا تھا، چار لاکھ درہم کے وزن کی ایک نقرئی اینٹ اسکے سپرد کی گئی، جسکو پگھلا کر
اصول ہیئت کے رو سے اولاً آسمان کی شکل کے چند دائرے بنائے گئے، اور انکو طبق در طبق پیوست کرکے کرہ کی
شکل میں تیار کیا گیا جو گویا مختلف طبق افلاک تھے، اور ایک دوسرا مدور کرہ زمین کا تیار ہوا، اور اسی عظیم الشان
سانچے پر دنیا کے تمام پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں، اور ان کے نشیب و فراز کی تصویر اتاری گئی، اسکے

۱؎ الوافی بالوفیات صفدی در اماری ص ۶۵۰، ۶۵۱، خریدۃ القصر در اماری ص ۶۱۱، نزہتہ المشتاق
وانسائیکلوپیڈیا آف اسلام ترجمہ ادریسی،

بنانے والے صقلی اہل علم تھے[1]،

مسلمانان صقلیہ اپنے اصول ہیئت و ریاضیات سے مذہبی امور میں عملی فائدہ بھی اٹھاتے تھے، صقلیہ کے
مین الاوقات کا تذکرہ ادریسی اور ابن فضل اللہ العمری نے کیا ہے، یہ ایک گھڑیال تھا، جو ایک چشمہ میں لگا ہوا
تھا، اور شہر کے مسلمانوں کو نماز کے اوقات سے مطلع کرتا تھا[2]،

صقلیہ کے ہیئت دان و منجمین کے چند نام معلوم ہو سکے ہیں، وہ یہ ہیں، (۱) ابو حفص عمر بن حسن بن النحوی
المنجم، (۲) ابو عبد اللہ محمد بن عیسی الصقلی المنجم، (۳) احمد بن مفرج المہندس الصقلی، (۴) ابو محمد عبد الکریم الصقلی المنجم، اور
(۵) ابو محمد عبد المعطی بن محمد السرقوسی[3]، اور اسی طرح وہ مہندسین بھی اسی زمرہ میں داخل ہیں جن کا تذکرہ اس سے
پہلے گذر چکا،

کیمیا سازی (کیمسٹری)

اس زمانہ میں معمولی دھاتوں میں تغیر و تبدل اور آمیزش کرکے اسے سونے اور چاندی میں منتقل کرنے کا امکان
تصور کیا جاتا تھا، اس کیمیا گری کا خبط صقلیہ کے بے فکروں میں بھی موجود تھا، ابن المؤدب الشاعر کے متعلق تصریح
ملتی ہے کہ جب وہ جرم کی پاداش سے روپوش ہوا، تو چند اپنے ہی ہم مشرب دوستوں کے گھر میں پناہ لی،
جو مخفی مکانوں میں بیٹھے دھاتوں کو الٹ پھیر کرکے کیمیا گری کی دھن میں لگے رہتے تھے[4]،

لیکن اسکے ماسوا مسلمانوں کی توجہ کیمیا سازی پر بھی مبذول تھی، اس موضوع پر بعض کتابیں بھی مثلاً کتاب
سر الکیمیا، اور کتاب عمل الاصباغ والمداد والحبر ابن، اول الذکر کتاب ابن بشرون الصقلی کی ہے، جس کا ایک نسخہ تیونس
میں محفوظ ہے، اور آخر الذکر کسی نامعلوم صقلی مصنف کی ہے، اس کا بھی ایک نسخہ تیونس ہی میں ہے، اس میں رنگسازی

۱؎ نزہتہ المشتاق ص ۵، ۲؎ " ومسالک الابصار ابن فضل اللہ العمری در اماری، ۳؎ اخبار العلماء باخبار
الحکماء ص ۱۰۹، خریدۃ القصر در اماری ص ۵۹۶، اخبار مصر ابن میسر ج ۲ ص ۶۴، ۴؎ ابن خلکان جلد ۲ ترجمہ
یحیی بن اکثم،

اور روشنائی بنانے کے طریقے درج ہیں، کریتفی نے کچھ اقتباس شائع کیا ہے، جن میں روشنائی کی مختلف قسمیں مختلف نسخے، اور بنانے کی مختلف ترکیبیں بیان کی گئی ہیں[1]

فلسفہ و منطق

فلسفہ و منطق کو سب سے آخر میں اسلئے جگہ دی، کہ اس کا تعلق زیادہ تر صقلیہ کے عیسوی عہد کے مسلمان اہل علم سے ہے، صقلیہ کے عہد اسلامی میں بجز ایک دو ناموں سعید بن فتحون القرطبی، اور ابو محمد عبد المعطی بن محمد السرقوسی کے ابھی تک علم میں نہیں آئے، سعید بن فتحون کے توطن پذیر ہونے کا تذکرہ گذر چکا ہے، اندلس سے اسکی ہجرت کا سبب اس کے بعض فلسفیانہ میلان ہی تھے، المنصور بن ابی عامر نے اسی جرم میں قید و بند میں ڈالا، اور رہائی پاکر اس نے صقلیہ کو اپنا مامن بنایا، اور یہاں اپنے مشاغل میں مصروف رہا، فلسفہ میں اسکی دو کتابیں معلوم ہیں، ایک شجرۃ الحکمت ہے جس میں علوم فلسفہ کے مبادی و مقدمات کا بیان ہے، اور دوسرا رسالہ تعدیل علوم ہے، جس میں جوہر و عرض کے انقسام کے بعد علوم کے بتدریج وجود پذیر ہونے تک بحث کی ہے[2] اور ابو محمد عبد المعطی بن محمد السرقوسی علم منطق کا عالم تھا،[3]

لیکن صقلیہ کے نارمن اور جرمن دور میں مسلمانان صقلیہ ہی یونانی فلسفہ کے مذاہب کے علمبردار تھے، اور کلیسا کے پادری اسلام سے منجملہ دیگر مذہبی اختلافات کے مسلمانوں کے اس ذوق فلسفہ کے باعث بھی بیزار تھے، کیونکہ مسلمانوں کے اثر سے عیسائیوں کے طبقوں خصوصاً فرمانروا خاندان میں ان علوم کی مقبولیت حاصل ہوئی، مثلاً راجر دوم (۱۱۰۵ء تا ۱۱۵۴ء / ۴۹۹ھ تا ۵۴۹ھ) کو ادریسی، ابن فضل اللہ الدمشقی، اور صفدی نے محب علوم فلسفیہ و عقلیہ لکھا ہے، اور فلاسفہ اور ماہرین علوم عقلیہ کا قدردان بتایا ہے،

اسی طرح فریڈریک دوم (۱۱۹۸ء تا ۱۲۵۰ء / ۵۹۵ھ تا ۶۴۸ھ) فرمانروائے صقلیہ عربی زبان و عربی علوم کے قدردان

---

[1] یادگاری مضامین جلد ۱ ص ۵۴۴، [2] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۵۶، طبقات الامم ص ۷۰، [3] المکتبۃ الصقلیہ [?] الحان المسیلہ دربا جلد اصفحہ ۲۹۷،

تھا، علوم فلسفہ و منطق صقلیہ میں اُس نے مسلمان اہل علم سے سبقاً سبقاً حاصل کئے، اور جب اسلامی ممالک پر چڑھائی ہوتی تو یہ اہل علم بھی اسکے ساتھ ہوتے، سبط ابن جوزی نے بیت المقدس کا واقعہ لکھا ہے، کہ جب مؤذن نے اذان دی، تو سب کے سب فراش غلام، اور استاذ اس کے پاس سے اٹھ گئے، یہ استاذ اس کے ساتھ صقلیہ سے آیا تھا، جو اس کو فلسفہ کا درس دیتا تھا، فریڈرک نے ان علوم کا اس کثرت سے مطالعہ کیا کہ رفتہ رفتہ عیسائیت سے برگشتہ ہو کر لامذہب ہو گیا، صاحب جامع التواریخ کا بیان ہے "اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ دہری ہے، عیسائیت کا مذاق اڑایا کرتا ہے[1]" اور پاپائے روما نے تو یہ کہہ کر کہ دین نصرانی سے خارج ہو کر مسلمانوں کی طرف مائل ہے، اس کے قتل کا فیصلہ دے دیا، مقریزی اور ابو الفداء وغیرہ نے بھی اس کے علوم عقلیہ میں تبحر کا تذکرہ کیا ہے[2]

وہ علمی شکوک و شبہات میں اپنے ہم عصر مسلمان سلاطین الکامل وغیرہ سے استمداد کرتا، چنانچہ ایک مرتبہ علم ریاضی، حکمت اور ہندسہ کے مسائل قلمبند کر کے اس کے پاس استفسار کے طور پر بھیجے، الکامل کی طرف سے شیخ علم الدین نے تسلی بخش جوابات بھیج دئے، اسی طرح اہل علم مسلمان سفراء سے بھی رجوع کرتا، الکامل کے سفیر امیر فخر الدین اور فریڈرک میں دقیق علمی مباحث زیر بحث رہے، شیخ جمال الدین متوفی ۶۹۷ھ سے بھی جو ملک الظاہر کے سفیر تھے، اس نے علمی شکوک رفع کئے، انھوں نے علم منطق میں ایک رسالہ اسی کے نام معنون کر کے "انبروریۃ" (انبرور یعنی امپرر) لکھکر اسے دیدیا تھا،[3]

اسی سلسلہ میں فریڈرک کی ایک اہم یادگار ابن سبعین متوفی ۶۶۹ھ کی کتاب مسائل صقلیہ یا "الفوائد الصقلیات" ہے، جو فریڈریک کے چند فلسفیانہ سوالات قدامت عالم، اور ماہیت، روح وغیرہ کے جواب میں ہے، اس کے دو نسخے بوڈلین اور اکسفورڈ میں ہیں، اماری نے کچھ اقتباس شائع کیا ہے، فریڈریک کا بیان ہے کہ اس رسالہ سے ان مسائل میں اسکی پوری تشفی ہوئی،

(باقی)

---

[1] جامع التواریخ ص ۵۱۵، ۵۱۶، [2] ابو الفداء جلد ۳ ص ۱۴۰، [3] کتاب السلوک لمعرفۃ دول الملوک در اماری ص ۵۲۲،

قصائدِ بدر چاچ پر ایک تاریخی نظر

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

سلطان محمد تغلق کا عہد اگر سیاسی واقعات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے، تو علمی حیثیت سے بھی یہ زمانہ کم ممتاز نہیں ہے، ہندوستان میں جسقدر مسلمان فرمانروا گذرے ہیں، سب نے کسی نہ کسی صورت میں علوم و فنون کی سرپرستی اور علما، مشائخ، شعرا، اور اہلِ علم کی قدر دانی کی ہے اگر ایک طرف انھوں نے میدان کارزار گرم کیا، تو دوسری طرف درباروں میں علمی مجالس سجائیں، اور توپ و تفنگ کی ہولناک گرج کے ساتھ انھوں نے علم و فن کا نغمہ بھی سنایا، ان کی قدر دانیوں اور فیاضیوں کا شہرہ سُنکر، مصر، شام، بغداد ترکستان، اور تمام دنیاے اسلام کے بڑے بڑے اہلِ کمال اور شعرا ان کے درباروں میں کھچے چلے آتے تھے، اور ان کے جود وکرم سے فیضیاب ہوتے تھے، خصوصًا وسط ایشیا کے اربابِ کمال سلاطین دہلی کے عہد میں آکر خوب چمکے، وسط ایشیا جو ان ہندی مسلمانوں کا آبائی وطن تھا، مدتوں علم و فن کا مرکز رہا، لیکن جس زمانہ میں ان کے فاتحانہ قدم ہندوستان میں داخل ہوئے، اسی وقت اس سرزمین میں علمی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا، اور ان کا دائرۂ کمال محدود، ذوق پست اور معیار گر چکا تھا، اس زمانہ میں وہاں جو اربابِ کمال پیدا بھی ہوے، تو وہ نا قدردانی کے ہاتھوں پردۂ گمنامی میں پڑے رہے، لیکن ان میں سے جو ہندوستان پہنچ گئے، وہ شاہانِ دہلی کی قدر دانی سے فیضیاب ہو کر خوب چمکے، ان علم پرور بادشاہوں کی فیاضیوں اور قدر دانیوں نے غیر ممالک سے اربابِ کمال کو کھینچ بلایا، یہ لوگ اپنے ساتھ جو علوم لائے، ان میں ہندوستان کی آب وہوا نے بڑی لطافت پیدا کر دی، اور بہت جلد

ہندوستان علم و ہنر کا گہوارہ بنگیا، علمی فروغ کے لحاظ سے علاء الدین کا عہد، زریں کہلانے کا مستحق ہے، اس دَور میں اس کثرت سے مشائخ، اولیا کبار اور علما، وفضلا جمع ہوئے، کہ ان کی نظیر ماسبق عہدوں میں نہیں مل سکتی، علاء الدین کے بعد علمی حیثیت سے سب سے نمایاں عہد محمد بن تغلق کا تھا، محمد تغلق اپنی ذہانت، اور اپنے پاکیزہ اور بلند علمی مذاق میں اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ ممتاز ہے، اس کا دربار آدب، فلسفہ، معقولات، حکمت، نجوم، ریاضی، اور منطق کا بیت الحکمۃ تھا، سعد جیسا منطقی، عبید جیسا شاعر، ضیاء الدین برنی جیسا مورخ، فقیہ شمس الدین جیسا حکیم اور شاعر، نجم الدین انتشار اور علیم الدین جیسے فضلا، ناصر الدین ترمذی جیسا واعظ، اور عبد العزیز اردبیلی جیسا فقیہ اور محدث جس نے تقی الدین ابن تیمیہ اور برہان الدین ابن الفرکح اور جمال الدین برنی و شمس الدین ذہبی وغیرہ سے تعلیم حاصل کی تھی، محمد شاہ تغلق کے دربار کی زینت اور اسکے ہم صحبت و ہمجلیس تھے، اور اس کی جود و سخا کی بارش سے سیراب ہوتے تھے، محمد تغلق کی علمی سرپرستی اور فیاضی صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ ہندوستان کے باہر کے اربابِ کمال بھی گھر بیٹھے اس کی فیاضیوں سے فیضیاب ہوتے تھے، چنانچہ عضد الدین شونکارنی کے پاس جو اپنے ملک میں فاضل کبیر القدر عظیم اللقب و شہیر الذکر تھے، دس ہزار دینار بھیجے، قاضی مجد الدین ولی شیرازی کی شہرت سُن کر اس کو دس ہزار روپے بھیجے، واعظ برہان الدین صاغرجی اپنی فیاضی کی وجہ سے قرضدار ہو گئے تھے، محمد تغلق کو جب اس کی خبر پہنچی، تو انکے پاس چالیس ہزار دینار بھیجے[۱] محمد تغلق کی یہ زرپاشیاں ایران، خراسان، فارس، اور وسط ایشیا میں بہت مشہور تھیں، اس کی اس داد و دہش اور علمی قدر دانیوں کی خبر سُنکر بیرونی ممالک سے جتنے علما اور طلبہ اس عہد میں دہلی آئے، اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے، جیسا کہ ابن بطوطہ لکھتا ہے، کہ یہ شہر اب جنوب وسطی ایشیا کا سب سے بڑا مرکز و مرجع بن گیا تھا،

ان بیرونی اربابِ کمال میں جو محمد تغلق کے دربار میں مہر و ماہ بن کر چمکے، ایک بدر الدین

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ مترجمہ محمد حسین، ص ۱۲۱ و ۱۲۰

چاچی بھی تھا،

بدر الدین کا وطن تاشکند (تاشقند) تھا، اسی شہر کا نام بعد کو چاچ مشہور ہوا، جسکو اہلِ عرب شاش کہتے ہین، اسی نسبت سے بہت سے شاشی علمار دنیاے علم میں روشناس ہوئے ہیں، بدر الدین اسی چاچ کی طرف منسوب ہو کر چاچی کہلایا، اور اپنی نظمون میں اپنا تخلص بدر لکھتا ہے، اور اس طرح وہ بدر چاچ کے نام سے شعر و سخن کے آسمان پر تابان ہوا، وہ محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا اور اس کا درباری شاعر مقرر ہوا، اسکی قابلیت کا سکہ ایسا جما کہ سلطان محمد تغلق نے اس کو فخر الزمان کے معزز خطاب سے سرفراز کیا، افسوس ہے کہ اس کی زندگی کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملتے، اسلئے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ ہندوستان کب آیا، تقی کاشی نے اس کا سن وفات ۷۵۴ھ بتایا ہے، [۵۱] جو ممکن ہے کہ صحیح ہو، میر غلام علی آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ہندوستان ہی میں سپرد خاک ہوا، [۵۲] مگر ہندوستان میں اس کی مدت اقامت کا پتہ نہ چل سکا، بعض قطعی شواہد سے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ کم از کم سات برس محمد تغلق کے دربار میں ضرور رہا، ۷۳۸ھ میں اس نے فتح نگرکوٹ پر ایک قصیدہ لکھا، اس کے بعد اس نے سلطان محمد تغلق کے جنگی کارنامون پر ایک مثنوی لکھی ہے، جس کی تاریخ اختتام ۷۴۵ھ ہے، [۵۳] اس کے یہ معنی ہوئے کہ بدر چاچ کم از کم ۷۳۸ھ سے ۷۴۵ھ تک ضرور شاہی دربار میں رہا، بدر محمد تغلق کی بارگاہ میں

۵۱ بانکی پور کیٹلاگ جلد ا ص ۲۱۰، بحوالہ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۰ء، ۵۲ ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ، ۵۳ قصائد بدر چاچ ص ۸۵، نولکشور پریس، نیز دیکھو برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد سوم ص ۱۰۳۲، ملا عبد القادر بدایونی اس کتاب کا ذکر کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ مثنوی عہد اکبری تک موجود تھی، اب یہ مثنوی مفقود ہے،

مادہ تاریخ اس شعر سے نکلتا ہے:-

سالِ تاریخ عرب و لیتِ شہ بود لبعد ۷۴۵ھ — کاسمان عقد سخنہاے مراداد نظام،

بڑا مقرب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ دیوگیر کی فتح کے موقع پر سلطان نے اسکو وکیل بنا کر بھیجا تھا، (اس کا ذکر آیندہ آے گا،)

ان تمام خصوصیات کے باوجود سیاسی مورخین نے اس کو بالکل فراموش کر دیا ہے، ضیار الدین برنی نے جو اس کا ہمعصر مورخ ہے، اپنی تاریخ مین اکثر اہلِ کمال اور مشاہیر زمانہ کا ذکر کیا ہے، لیکن بدر الدین چاچی کا حال کہین نہیں لکھتا، ضیار الدین برنی مقرب ہونے کے سبب سے خلوت و جلوت میں ہر وقت سلطان کے ساتھ رہتا تھا، اسلئے محمد تغلق کے جزوی سے جزوی حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان تاریخی واقعات کو بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ لکھتا ہے، جو بدر الدین چاچ نے منظوم کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کئے، اس کے باوجود بدر چاچ کا نام برنی کے قلم کا ممنون نہیں ہوا، ابن بطوطہ نے بھی جو ۷۳۴ھ سے ۷۴۳ھ نو سال تک تغلق کے عہد میں ہندوستان میں رہا، اور اس عہد کے اکثر شعرار فقہار محدثین اور واعظون کا ذکر کیا ہے، مگر فخر الزمان بدر الدین چاچ کو اس نے بالکل فراموش کر دیا ہے، اسی طرح فرشتہ نے جو گو بہت بعد کا مورخ ہے، لیکن تغلق کے متعلقین شعرار اور علمار کا ذکر خیر کیا ہے، مگر اس کی ضخیم تاریخ میں بھی چاچ کا نام کہیں نہیں نظر آتا، سیاسی مورخون میں صرف ملا عبد القادر بدایونی نے جو عہد اکبری کے ممتاز مورخ ہیں، بدر چاچ میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے،

"از شعراے مشہور در زمانِ سلطان محمد بدر شاشی است، کہ شاہنامہ بنام او گفتہ قریب بسی ہزار بیت و ہمیں کہ تاریخ منظوم ست، غنیمت است[۵۴]"

گو سیاسی تاریخون مین بدر چاچ نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن شعرار کے تمام مستند تذکرون میں اس کا ذکر موجود ہے، اور سب اوس کو ایک دقیقہ سنج، نکتہ پرداز اور مسلم الثبوت شاعر بتاتے ہیں،

مولوی غلام علی آزاد اپنے تذکرہ ید بیضار میں لکھتے ہین،

۵۴ تاریخ بدایونی جلد اول ص ۲۴۱،

"بدر چاچی از اساتذہ شعراست، در آخر عمر بہند آمدہ و از سلطان محمد شاہ عنایت و رعایت بسیار یافتہ بفخر زمان مخاطب گشتہ ہمیں جا در گذشتہ وی در کلام خود تشبیہ و کنایت اکثر بکار بردہ و ازیں سبب از سلاست و چاشنی عاری ماندہ"[1]

مخزن الغرائب مصنفہ احمد علی خاں ہاشمی سندیلوی (۱۲۱۸ھ) میں ہے:-

"بدر الدین چاچ مداح سلطان محمد تغلق بادشاہ دہلی است، و معاصر خسرو است و دیوانش تمام نغز و معما است، اکثر مردم فخر می کنند کہ فلاں کس دیوان چاچ را درس می گوید"[2]

مفتاح التواریخ (۱۲۶۳ھ) کا مصنف یوں رقمطراز ہے:-

"شاعرے شیریں کلام سخن سنج، بلند طبیعت بودہ، و در عہد سلطنت محمد تغلق بادشاہ ہند ظہور نمود و از بادشاہ لقب فخر زمان یافتہ"[3]

صاحب روز روشن (۱۲۹۷ھ) لکھتے ہیں:-

"بدر تا تسکندی درویشے بود، آزاد مشرب و نیکو سیرت"[4]

صبح گلشن مصنفہ نواب علی حسن خاں صاحب مطبوعہ ۱۲۹۵ھ میں ہے،

"بدر چاچی بدر سمار دقیقہ سنجی و مہر سپہر نکتہ پردازیست و بعد رسیدن ہند و حضوری حضور سلطان محمد تغلق شاہ خطاب فخر زمان اورا مایہ سرفرازی خودش در سرزمین ہند مقبور و کلامش بر زبانہائے زبان داناں مذکور است"[5]

پروفیسر براؤن نے بھی بدر چاچ کا ذکر کیا ہے، اور اسکو خسرو اور حسن دہلوی کی صف میں کھڑا کیا ہے[6]

بدر چاچ کو خود اپنے بلند پایہ، بے مثل، اور قادر الکلام شاعر ہونے کا احساس ہے، چنانچہ ایک

[1] ید بیضا، قلمی نسخہ، دار المصنفین، اعظم گڈہ، [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین [3] مفتاح التواریخ باب ششم ص ۱۲۳

[4] روز روشن مصنفہ مظفر حسین ص ۸ بھوپال [5] صبح گلشن ص ۵۷، [6] لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۳،

فخریہ قطعہ میں کہتا ہے:-

اے راندہ بر زبانِ مبارک ہزار بار،	کامروز ہمچون فخر زمان در جہان کجاست
مثلش زمیں ندارد و بر روئے آسمان،	جز در شبِ چہاردہ او در نشاں کجاست
بدرست باز در خور بدرہ ہزار بار	کاندر زمان چو او بزباں داستاں کجاست
چوں بحر کامل است بہر فن بجوئے فضل	از لفظِ او لطیف تر آبِ رواں کجاست
در اہتمام شرع محمد نظیر او،	مفتی با صلابت و حیدر بیاں کجاست
جزوی کہ از محاسن خود خاکِ ایں جناب	در ہر صباح و شام بر و دیجاں کجاست
جزوے کہ بے کمان گماں بگذرد بصبح	تیر دعائش بر سپر آسمان کجاست
جزوے کہ فخر نام وے از خاکِ ایں درست	یک نکتہ دان دیں طلب ثمر ساں کجاست

بدر چاچ کے قصائد تاریخی حیثیت سے نہایت اہم ہیں، کیونکہ اس میں اس نے ان تمام سیاسی واقعات کو جو اس کے عہد میں ہوئے منظوم کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کیا ہے، اس لئے اس عہد کے تاریخی مواد کے لئے نہایت مفید اور مستند ہیں، الیٹ نے اپنی تاریخ میں اس کا ترجمہ بھی کیا ہے[1]، قصائد بدر چاچ میں متفرق قطعات کے علاوہ ایسے قصائد بھی ہیں، جو وقتاً فوقتاً بادشاہ کی خدمت میں لکھکر پیش کئے گئے، بدر چاچ ایک نہایت مشکل گو شاعر ہے، اسکو چرخیات اور فلکیات سے خاص ذوق ہے، اس نے ان کی تشبیہات اور ان کے استعارات سے اپنے کلام کو اسقدر پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے، کہ اس کا بغیر شرح سمجھنا مشکل ہے، بعض قصائد تو خالص چرخیات اور فلکیات پر ہیں، جو اس زمانہ کے تمدنی مذاق کے حامل ہیں، تاریخی قدر و قیمت کے علاوہ یہ قصائد اپنے جزالتِ بیان شوکتِ الفاظ دقائقِ معانی اور اعجازِ کلام کے لحاظ سے فارسی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں،

[1] الیٹ جلد سوم،

خلافت عباسیہ اور شاہ ہند کے تعلقات،

قصائد میں پہلے اس نے حمد باری، عشق مجازی، عشقِ حقیقی، مدح سلطان اور پھر اپنے مفاخر لکھے ہیں، اس کے بعد تین چار قصیدوں میں اس نے خلیفہ عباسی کی جانب سے سلطان کی خلعت اور خطاب سے سرفرازی کے واقعات لکھے ہیں، اس عہد کے بعض دوسرے سلاطین کی طرح سلطان محمد تغلق کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر حکومت جائز نہین، خلافتِ عباسیہ اسلامی حکومتوں میں مذہبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، اس لئے ہر اسلامی سلطنت بارگاہِ خلافت سے سیاسی طور پر وابستہ رہنا ضروری سمجھتی تھی، خلیفہ بغداد کے ساتھ سلاطینِ ہند کی یہ عقیدتمندی ابتدا ہی سے تھی، چنانچہ سلطان شمس الدین التمش، سلطانہ رضیہ، سلطان ناصر الدین محمود اور سلطان علاء الدین محمد وغیرہ کے سکوں پر خلیفہ مستنصر باللہ کا نام سلطان کے پہلو بہ پہلو نقش تھا، سلطان ناصر الدین محمود، سلطان بلبن، سلطان کیقباد، سلطان جلال الدین فیروز شاہ، اور سلطان رکن الدین کیکاؤس کے سکون پر مستعصم باللہ کا نام ملتا ہے، محمد تغلق کے زمانہ میں یہ خوش اعتقادی یہان تک بڑھ گئی، کہ اسکو یہ یقین ہو گیا، کہ آلِ عباس کے خلفا برحق ہین اور جو شخص بغیر ان کی اجازت کے سلطنت کرتا ہے، اس کی اطاعت مسلمانون پر فرض نہین، بلکہ ان سے سند حاصل کئے بغیر حکومت کرنے والے غاصب ہین، ضیاء الدین برنی لکھتا ہے،

"در خاطر افتاد کہ سلطنت و اجازت سلاطین بے امر و اذن خلیفہ کہ از آن عباس بود درست نیست، و ہر بادشاہ کہ بے منشور خلفاء عباسی بادشاہی کردہ است یا بادشاہی کند، متغلب بودہ است و متغلب بود"[1]

اس یقین و اعتقاد کی بنا پر سلطان نے مع ارکانِ دولت کے مصر کے عباسی خلیفہ کی غائبانہ بیعت کی، اسوقت بغداد میں عباسی خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا، اور مصر میں چرکسون کے ماتحت خلافت عباسیہ کا ایک نیا ڈھانچہ قائم ہوا تھا جس مین عباسی خلفا محض برائے نام تھے، اصل حکمران چرکسی تھے،

[1] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۴۹۲

عباسی خلفا محض تبرکاً تھے، چنانچہ سلطان نے ایک عریضہ لکھکر مصر کی بارگاہِ خلافت مین روانہ کیا کہ اسکو ہندوستان اور سندھ کے ممالک پر حکمرانی کی اجازت دی جائے، اس درخواست پر ۷۴۴ھ میں حاجی سعید صرصری کے ہمراہ مصر سے سلطان کے لئے خلعت، لوائے سلطنت اور فرمان آیا، سلطان نے تمام ارکان دولت، علماء، سادات اور مشائخ کے ساتھ شہر کے باہر نکل کر استقبال کیا، فرمان خلافت کو سر پر رکھا، اور حاجی سعید کے قدمون کو بوسہ دیکر چند قدم پیادہ اس کے جلوس کے ساتھ چلا، اس سرفرازی پر تمام شہر میں جشن منایا گیا، اشرفیان لٹائی گئین، سلطان نے اظہارِ عقیدت و اطاعت مین زربفت کے کپڑون، اور مساجد کے منبر کے قبوں پر خلیفہ کا نام نقش کرایا، اس سرفرازی کے بعد سلطان نے بطور شکریہ دوسرا مخلصانہ عریضہ اور ایک نفیس موتی جس کا مثل خزانۂ شاہی میں موجود نہ تھا، حاجی رجب کے ہمراہ خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیا، حاجی رجب دو سال بعد مصر کے شیخ الشیوخ رکن الدین کے ہمراہ خلعتِ خلافت اور علمِ امارت لیکر واپس ہوا، اس مرتبہ خلیفہ نے ایک خلعت کے ہمراہ ایک کلام پاک، اور حدیث کی مشہور کتاب مشارق سلطان کو بھیجی، سلطان نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اسی شان سے خلیفہ کے قاصد کا استقبال کیا، اور اسکے ہمراہ محل کے دروازہ تک پا پیادہ آیا، اور خلیفہ کے مرسلہ مصحف پاک، مشارق اور فرمان کو سامنے رکھ کر لوگوں سے اپنے ہاتھ پر خلیفہ کی بیعت لی، اس کے بعد سلطان اور خلیفہ کے درمیان نامہ و پیام اور تحفہ تحائف کا سلسلہ برابر جاری رہا،[1]

بدر چاچ نے ان تمام واقعات کو قصائد میں نظم کیا ہے، خلیفہ کی جانب سے سلطان کی فرمانِ حکومت اور خلعت سے سرفرازی کے موقع پر بدر چاچ نے دربار شاہی میں حسب ذیل قصیدہ پیش کیا،

جبرئیل از طاقِ گردون ابشروا گویان رسید ۔۔۔ کز خلیفہ سوے سلطان خلعت و فرمان رسید
ہمچنان کز بارگاہ کبریاے لایزال ۔۔۔ از پئے عزِ محمد آیت قرآن رسید

[1] تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی ص ۴۹۱ تا ص ۴۹۴،

شاہ را بر کلِ عالم حکم مطلق داد امام، ‏ دین خبر در ہفت کشور بر ہمہ شاہاں رسید
جاہِ حاسد را چو چاہِ یوسفی بے آب کرد ‏ خلعتِ مصری کہ از کنعان بہندستان رسید
حاسدِ آتش نژاد و خاک بر سر کن چو باد ‏ کز خضر سوی سکندر چشمۂ حیوان رسید
ملک را بازو قوی شد دین سرافرازی نمود ‏ شرع را حرمت فزوں شد رونقِ ایمان رسید
راست عید مومنان آمد کہ در سالے دو بار ‏ از امیر المومنین خلعت سوے سلطان رسید
ہم بتاریخی کہ ماہ از سال ہفصد شد فزون ‏ زین سفر ماہ محرم سابق شعبان رسید
(رجب) (نام قاصد)
راست گویم ماہ حق سوے جناب ظلِ حق ‏ صبح دار از آفتاب ملکِ دین خندان رسید
(شہر اللہ (رجب))
در د اسلامی کہ در سر داشت شاہنشاہِ عصر ‏ از ولی المسلمین ایں در د را درمان رسید

سلطان محمد تغلق نے خلیفہ کے سفراء کا جس شان سے خیر مقدم کیا تھا، اس کو بدر چاچ نے اس طرح دکھایا ہے،

باستقبالِ فرمانی کہ از پیش امام آمد ‏ برہنہ پا و سر کردہ چوں ایمان شتر اسلامش
خلائق پیش و پس پویاں ملائک گرد حق گویان ‏ زجزع شہ شدہ غلطان گہر بر نقرۂ خامش
چو شہ پوشید خلعت را برنگ مردمِ دیدہ ‏ میانِ روز میدیدیم شب را با مہ تامش
فلک را دیدم آن ساعت بدامن در ستِ زر ‏ نثار افشان بہر جانب رواں در زیر اعلامش
ز آئینہا کہ شد بستہ ندیدم یکسرِ موئے، ‏ سر ہر قبہ را فرقے نہ ہفتم طاق و نہ بامش

ایک دوسرے قصیدہ میں لکھتا ہے، :-

دوش آن زماں کہ خسرو زریں قباے خود ‏ در میکشید خلعتِ عباسیان ببر
شاہِ سیاہ ہند کہ ماہ ست نام او ‏ پر کرد طشت ہاے زمرد در ستِ زر

[1] یعنی سیاہ و سفید آنکھ کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں، [2] یعنی سیاہ جو عباسیوں کا سرکاری نشان و رنگ تھا،

یعنی رسید خلعت و فرمانِ سلطنت ‏ از حضرتِ خلیفہ بدارائے بحر و بر
والیِ عصر احمدِ عباس امامِ حق ‏ دارائے دہر وارثِ پیغمبرِ بشر
ہر قبہ نو عروس زر اندودہ پیرہن ‏ ہنگامہ وار مجلسِ حورانِ نغمہ گر
ایں جشنِ شادیست کہ از حضرتِ امام ‏ آوردہ اند خلعت و فرمانِ معتبر
مضمونش آنکہ در کنفِ حفظِ شاہ باد ‏ بر روے خاک آبی و بادی و خشک و تر
اقلیم ترک و روم و خراسان و چین و شام ‏ مامورِ امرِ شاہ بد و نیک و خیر و شر
القابِ شہ کہ بر سرِ منبر برد خطیب ‏ سلطانِ شرق و غرب و شہنشاہِ بحر و بر
سلطانِ دین محمد تغلق جہانِ عدل ‏ ماہ زحل مکانت و شاہ مسیح فر
خلعت برنگ مردمکِ چشم داد امام ‏ تا نورِ شرع در دلِ مردم کند اثر

بدر چاچ خلعت کی تقریب کے درباری جشن کا نقشہ اس طرح دکھاتا ہے،

بعید نیست کہ این جشنِ جنۃ الماوی ست ‏ صف ملائکہ اینک ستادہ از چپ و راست
درونِ پردہ بہر گوشۂ کہ چنگ زنی ‏ ہزار مطرب گویا و عندلیب نوا ست
زبیلِ کوہِ رواں بین زبوق نفخۂ صور ‏ قیامتست کزین ہر دو در جہاں برخاست
اگر نہ خلد برین ست این ہزار ستون[1] ‏ چرا فضاے درش عرضگاہِ روز جزا ست
بلے چنان خرم آباد[2] آنچنان شاہیست ‏ کہ او متابعِ امرِ خلیفۂ دنیا ست
ابو الربیع سلیمان خلیفۂ بر حق ‏ کہ آستانِ درش آسمانِ عز و علا ست
امامِ امتِ احمد کہ خسرو ہندش ‏ بجان غلام و بتن چاکر و بدل مولا ست
ابو المجاہد غازی محمد تغلق ‏ کہ ہند دور او بادشاہ چین دختا ست

[1] قصر شاہی کا نام، [2] اوس زمانہ کی سرکاری ولی کا نام،

فتح نگر کوٹ، بدر چاچ نے ایک قصیدہ نگر کوٹ کی فتح کی تقریب پر بھی لکھا ہے، جسکو سلطان محمد تغلق نے ۷۳۸ھ میں تسخیر کیا تھا، نگر کوٹ کا قلعہ اپنی مضبوطی اور استحکام کے لئے مشہور تھا، تاریخ فیروز شاہی کا مصنف شمس سراج عفیف بھی اس کو نہایت ہی مستحکم قلعہ بتاتا ہے، چنانچہ فیروز شاہ اپنے زمانہ مین اسکو مسلسل چھ مہینے کے محاصرہ اور منجنیق کی تباہ کن گولہ باریوں کے بعد فتح کر سکا تھا، عفیف کا بیان ہی،

"چو سلطان فیروز طالب ثراہ حضرت در دو فرود قلعہ نگر کوٹ رسید مر آن مقام را بغایت مستحکم و محکم دید ورای نگر کوٹ بالای قلعہ در مقامات قلب خزیدہ جیوش سلطانی و جیش جہانبانی بیت ربانی قلعہ را گرد گردہ فرود آمدہ تو بر تو بلکہ بدورہ نو گرد گرفتہ فرود آمدہ از ہر دو جانب منجنیق داشتہ از طرفین سنگ عرادہ خاستہ چنانچہ سنگہای جانبین از پلہ منجنیق طرفین بیکدیگر در ہوا و بکہ میخوردند قطرہ قطرہ می شدند، مدت شش ماہ جیوش فیروز شاہ قلعہ را گرد گرفتہ بودند[1]"

سلطان محمد تغلق کو بھی اس کی فتح میں بڑی دشواری پیش آئی تھی، تاریخون میں اس مہم اور سلطان کی دشواریوں اور کوششوں کے حالات نہیں ملتے، بدر چاچ کے اشعار سے اسقدر پتہ چلتا ہے، کہ اس سنگین اور مستحکم قلعہ کی تسخیر میں تمام امکانی ذرائع صرف کر دیے گئے تھے، اور وہ اس وقت تک فتح نہ ہو سکا تھا جب تک کہ منجنیقون کے آتش بار گولوں نے اس کو شق نہ کر دیا، بدر چاچ کے اشعار ملاحظہ ہون،

چو بادشاہ جہانگیر عالم بالا | بفرد خانہ مہر و وزیر شد تنہا
کشاد حصن نگر کوٹ را کہ سنگین بو | شہ زمانہ بتاریخ ادخلوا فیہا
چہ قلعہ ایست کہ فرشی بود ز رفعت او | فضائے عرصہ بام رواق او ادنیٰ
چو بام چشم بلندست وہمچو مردم چشم | ازان سواد وی آمد میانہ دریا
نہاد او ز صفا بود وآن صلابت داشت | کہ مور دانہ سکندر گرفت نہ دارا،

[1] فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۱۰۰،

برون او ہمہ دیوان منجنیق انداز | درون او ہمہ حوران آفتاب لقا،
برین حصار معظم شہنشہ عالم | بشب در آمد با صد ہزار عز و علا،
قطار موکب اقبال در توجہ وی | سوار لشکر ارواح در فضائے قفا
صفیکہ چون مژہ در پیش حاجبان میرفت | ہزار کوکبہ ہر کوکبہ ہزار لوا،

تعجب ہے کہ محمد تغلق کے نگر کوٹ کی مہم کا تذکرہ کسی تاریخ مین نہیں آتا، برنی اور اس کے بعد کے مورخین اس کا مطلق تذکرہ نہین کرتے، حالانکہ بدر چاچ کا اسی واقعہ کو منظوم کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کرنا اس کی اہمیت کی بین دلیل ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ اس سال کی ہماچل کی ہنگامہ خیز مہم نے اس واقعہ کو بالکل فراموش کر دیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسی سال (۷۳۸ھ) میں سلطان نے قراچل یا ہماچل (کوہ ہمالیہ) کی تسخیر کے لئے ایک لاکھ کارگذار سواروں اور دربار کے نامی امیرون کے ساتھ اپنے بھانجے خسرو ملک کو اس مہم پر روانہ کیا تھا، لیکن یہ تمام فوجین اس بری طرح سے برباد ہوئین، کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا[1]، اس ہولناک تباہی اور بربادی کے بعد سلطان کی سیاسی اور جنگی قوت بہت کمزور پڑ گئی، اس لئے تمام ملک میں سرکشی اور بغاوتیں شروع ہو گئین، مالوہ مین سلطان کے بھانجے بہاء الدین نے (۷۳۸ھ) علم بغاوت بلند کیا[2]، ملک فخر الدین نے بنگالہ میں ہنگامہ برپا کیا[3]، قلعہ کندھانہ کا ناک نایک بھی باغی ہو گیا، ابھی ان ہنگامون کو سلطان فرو بھی نہ کر سکا تھا، کہ ملک بہرام ایبہ حاکم ملتان نے (۷۳۹ھ) مخالفت اختیار کر کے پنجاب میں تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا، اور ملک گیری میں اپنے کو سلطان کا حریف قرار دیا[4]، ان بغاوتون کا سلسلہ مدتوں تک جاری رہا، اسی طوائف الملوکی مین نگر کوٹ جو غالباً ہماچل کی مہم کے پہلے فتح ہوا تھا، سلطان کے

[1] تفصیل کے لئے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی ص ۴۷۷، ۴۷۸ [2] دیکھو [3] برنی ص ۴۸۱ [4] ص ۴۸۰ [5] ص ۹، ۴۸۳،

ہاتھوں سے نکل گیا، اور پھر اس کی زندگی میں اس کے قبضہ میں نہ آسکا، سلطان کے بعد اس کے جانشین فیروز شاہ نے اسکو فتح کرکے اپنے محسن اور آقا کے نام پر اس کا نام محمد آباد رکھا،[1]

گو سلطان محمد کے نگر کوٹ کی فتح کے مستقل حالات ہمکو کہیں نہیں ملتے، لیکن بعض بیانات سے محمد تغلق کا نگر کوٹ آنا قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے، عوام میں یہ روایت مشہور تھی، جیسا کہ شمس سراج عفیف بیان کرتا ہے، کہ سلطان محمد تغلق جب نگر کوٹ آیا تو وہاں کے مشہور بت جوالا مکھی کو دیکھنے گیا، اور دستور کے مطابق اس پر چتر زرین چڑھایا، اس قسم کی روایت فیروز شاہ کی طرف بھی منسوب کیجاتی ہے، جب فیروز شاہ نگر کوٹ میں فاتحانہ داخل ہوا، تو وہ بت دیکھنے کو گیا، اور محمد تغلق کی طرح اس پر چتر زرین کا سایہ کیا،[2] اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ فیروز شاہ کی طرح محمد تغلق بھی نگر کوٹ میں فاتحانہ داخل ہوا تھا، اور یہ کہ جوالا مکھی کا مندر اس کے قبضہ میں رہ چکا تھا، عفیف بت پر چتر چڑھانے کی روایت کی تردید کرتا ہے، لیکن نگر کوٹ کے آنے کی تردید نہیں کرتا، اگر محمد تغلق اس میں فاتحانہ داخل نہوا ہوتا، تو اسی استدلال سے چتر چڑھانے کے واقعہ کی تردید کرتا،

اسی طرح فرشتہ کی ایک روایت ہو کہ جب فیروز شاہ نگر کوٹ کے دامن میں پہنچا، تو اس کے واسطے برف آئی اس موقع پر فیروز شاہ کو سلطان محمد تغلق کا یہ واقعہ یاد آیا، کہ اسی مقام پر سلطان تغلق کے لئے برف کا شربت آیا تھا، لیکن چونکہ وہ (فیروز شاہ) اس وقت موجود نہ تھا، اسلئے بادشاہ نے شربت پینا گوارا نہیں کیا تھا، محمد تغلق کے اس شفقت آمیز واقعہ کی یاد سے متاثر ہو کر فیروز شاہ نے حکم دیا، کہ تمام لشکر کے لئے قند کا جو کئی ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدا ہوا تھا، شربت بنایا جائے، اور اس میں برف ملاکر محمد تغلق کی یادگار میں کل سپاہیوں کو پلایا جائے،[3]

ان مختلف واقعات سے یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے، کہ محمد تغلق نگر کوٹ آیا تھا، اور فاتح ہو کر آیا تھا،

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۴۷، [2] عفیف ص ۱۸۶-۱۸۷، [3] فرشتہ جلد اول ص ۱۴۷،

مگر چونکہ نگر کوٹ کی فتح دیرپا نہ تھی، اور اسی سال ہماچل کی مہم کی بربادی کا افسوسناک واقعہ پیش آگیا، اس کی بربادی میں مورخین نگر کوٹ کی مہم بھول گئے، بدر چاچ کے اس قصیدہ نے تاریخ کے اس گمشدہ ورق کو سامنے لا دیا ہے،

بدر چاچ کی روانگی دیوگیر، ۷۴۵ھ میں سلطان محمد تغلق نے بدر چاچ کو دیوگیر کے فاتح قتلغ خان کے پاس ایک پیغام دیکر بھیجا، دیوگیر وہی جگہ ہے، جسکو محمد تغلق نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام سمجھکر اپنا پایہ تخت بنایا تھا، محمد تغلق نے جب دہلی کے بجائے دیوگیر کو پایہ تخت بنایا، تو اس کا نام دولت آباد رکھا، سلطان یہاں ۷۲۷ھ میں منتقل ہوا، لیکن ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا، کہ گرشاسپ اور بہرام ایبیہ (حاکم ملتان) کی بغاوتوں کے سبب اسکو ۷۲۸ھ میں دہلی لوٹنا پڑا، اس کے بعد وہ ۷۴۲ھ تک دکن کی جانب نہیں گیا، اسی دوران میں سارے شمالی ہند میں بغاوتیں پھیل گئیں، اسوقت محمد تغلق کو معلوم ہوا کہ دہلی سے دولت آباد دار السلطنت تبدیل کرنا خطرے سے خالی نہیں، اور ہندوستان کے حکمراں کے لئے دہلی میں رہنا ضروری ہے، ورنہ شمالی ہند کو قابو میں نہیں رکھا جا سکتا، اس لئے محمد تغلق کو پھر دہلی کو دار السلطنت بنانا پڑا، اور قتلغ خان جو محمد تغلق کا استاد تھا، دولت آباد کا حاکم مقرر ہوا، محمد تغلق قتلغ کے ساتھ بڑی عزت اور محبت کا برتاؤ کرتا تھا، چنانچہ ۷۴۴ھ میں بارگاہ خلافت سے جب اس کے لئے فرمان اور خلعت آیا، تو بدر چاچ کو بھیج کر قتلغ خان کو بلایا، کہ وہ بارگاہ خلافت کی مبارک چیزوں کو آکر دیکھ لے،

بسالِ دولتِ شہ بود غرۂ شعبان — کہ سوے مملکت دیوگیر شہ فرمان

خطاب کرد اے بدر جمال ملیح — بہ نیک روز روان شد چو رستم دستان

درآن جناب درآئید و رخ برآب نہید — چو خاک بر در دارائے ملک قتلغ خان

سلطان جس اشتیاق سے قتلغ خان سے گفتگو کرنے کی ہدائتیں دیتا ہے، وہ آخر الذکر کی طرف سے اسکی عزت، وقعت اور محبت کی بین دلیل ہے، سلطان ہدایت دیتا ہے کہ

بشہد شستہ دہان از زبانِ ما گوئید
کہ اے ز گوہر لفظت لبِ شکر خندان

فروغ آئینہ سینۂ مبارک تست
شروق پرتو شمع معارفِ سبحان

توئی خلاصۂ اہلِ قراضۂ ایجاد
توئی نفاسۂ اہلِ عراضۂ انسان

بیاد بر لبِ دریائے وصل خود مارا
چو بحر پیش بلبہائے خشک تشنہ ممان

بیا ہی و سرمہ صفت بر بیاضِ دیدہ بمال
سوادِ خلعتِ فرخندۂ امامِ زمان

بیا ہی و چون مژہ بر طرف نام چشم بنہ
بیاضِ آیتِ منشور والئ دوران

بادشاہ بدر چاچ کو پھر ہدایت کرتا ہے، کہ وہ پیغام پہنچاتے وقت قتلغ خان سے اسطرح پیش آئے،

چون این خطاب ز ما پیش خان فرو خوانے
بدست بوس دو اتش چو خامہ سجدہ کنان

بہر خطے کہ کشد سر نہید ہمچو قلم،
بہر عطا کہ دہد جان دہید بر سر آن،

چو در نہوض شود موکب جلالتِ خان
بسوئے تختگہ شاہ بحر و بر سلطان

خبر کنید جہان را کہ خواجہ می آید
چو آفتابِ منور ز سایۂ یزدان

لیکن قتلغ خان کی یہ محبوبیت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی، کچھ عرصہ کے بعد سلطان کے کانوں میں یہ خبریں پہنچنے لگیں، کہ مرہٹواڑی کا علاقہ اور دولت آباد قتلغ خان کے گماشتوں کے ظلم وستم سے ویران اور برباد ہو رہا ہے، اور مالگذاری مشکل سے وصول ہوتی ہے، اسلئے سلطان نے قتلغ خان کو معزول کرکے مع اہل و عیال ۷۴۴ھ میں دہلی میں بلالیا، اور اس کی جگہ اس کے بھائی نظام الدین کو بھیجا، قتلغ خان بہر حال ایک لائق، ہوشمند، اور مقبول حاکم تھا، اسلئے اس کی معزولی سلطان کو راس نہ آئی، چنانچہ قتلغ خان کے ہٹنے کے ساتھ ہی سلطان کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوا، اور باغیوں نے ان تمام سرداروں کو جو سلطان نے جدید انتظام کے لئے مقرر کئے تھے، قتل کر دیا، اور ایک امیر مغ خان کو اپنا سردار بنا کر دولت آباد کے پورے علاقے کو آپس میں تقسیم کر لیا، اس بغاوت کو فرد کرنے کیلئے

بادشاہ خود دولت آباد گیا، گرچہ باغیوں کو شکست ہوئی، لیکن قلعہ دولت آباد فتح نہ ہوسکا، ابھی سلطان قلعہ کو فتح کرنے اور حکومت قائم کرنے مین مشغول تھا کہ خبر پہنچی، کہ طغی نامی غلام نے گجرات میں شورش پھیلا رکھی ہے، اسلئے سلطان دولت آباد کو فتح کئے بغیر گجرات روانہ ہوگیا، اسکے ہٹتے ہی حسن گانگو نے دولت آباد آکر تمام سلطانی اہلکاروں کو بے دخل کر دیا، اور دیوگیر اور مرہٹوں کا تمام علاقہ سلطانی قبضہ سے نکل گیا، سلطان اس بغاوت کے استیصال کیلئے آنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا، کہ پیام اجل آپہنچا[1]،

قلعہ دہلی،

شاہی قلعہ پر بدر چاچ نے دو قصیدے لکھے ہیں، ۷۴۴ھ میں سلطان نے تغلق آباد میں ایک محل بنوایا تھا، جو ہزار ستون کہلاتا تھا، یہ محل اس ہزار ستون نامی محل کے علاوہ ہے جس کو سلطان ناصر الدین محمود نے رائے پتھورا کے قلعہ میں بنوانا شروع کیا تھا، اور غیاث الدین بلبن نے اس کو پورا کیا تھا، محمد تغلق نے ایک جدید محل بنوایا تھا، اس کا ایک محل تو وہ قلعہ تھا، جو دار سرا کہلاتا تھا، جس کا ابن بطوطہ نے نہایت تفصیلی ذکر کیا ہے[2]، اس کے علاوہ دوسرا قلعہ ابن بطوطہ کے جانیکے بعد ۷۴۴ھ میں ظہیر الدین معمار کے اہتمام میں تعمیر ہوا تھا، یہ قلعہ خرم آباد بھی کہلاتا تھا، بدر چاچ کہتا ہے،

خرم آباد نام کردش شاہ
چو ظہیر الجیوش شد معمار،

شد تمام این عمارتِ خرم
در محرم بہ ہفتصد و چل و چار،

برین عمارتِ خرم برین خجستہ سرائے
ہزار دیدہ کشاد ست چرخ آئینہ دار

شد بنام خلیفہ با مر خسرو عہد
برین عمارتِ خرم ظہیر دین معمار

تمام گشت بتاریخ وادخلو فیہا
کشادہ باتو بگوئیم کہ ہفتصد چہل چار

بدر چاچ اس قلعہ کی شوکت کو اس طرح دکھاتا ہے،

سواد قلعہ اگرچہ دنیا ست
ہزار بار فزون تر ز جنۃ الماوی ست

۱؎ برنی ص ۵۲۵، ۵۱۰، ۲؎ سفر نامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۹۹

چہ قلعہ ایست کہ قوسی ز حلقہ دارد،　　محیط نہ رہفِ ہفت طارم اعلیٰ است

اگر نہ خلد برین این ہزار ستون　　چرا فضاے درش عرصہ گاہ روز جزا ست

چہ قلعہ ایست کہ جلالت کہ بارہ اروی　　محیط شش جہت وہشت روضہ عقبیٰ است

ایک دوسرے قصیدہ میں کہتا ہے،

شکوہ قلعہ قلعے عمارت نہ تہ　　نمونہ ایست ز برج حصار قلعہ شہ

محیط ہفت فلک راز نقطہ کم یافت　　میانِ دائرہ حلقہ دراو مہ

زہی حصار کہ در روی تہی بنا کردند　　فلک چو ریگ کبود نمود در تگِ چہ

چو آسمان بسوے قصر شاہ کرد نظر　　بر فعتش ز سر آسمان فتاد کلہ

یہ قلعہ محمد آباد اور عادل آباد بھی کہلاتا تھا، اب یہ قلعہ بالکل ویران ہے، اور اوس کے آثار تغلق آباد میں پائے جاتے ہیں،

گلچہرہ کنیز، بدر چاچ نے مختلف موقعوں پر اور بھی قصائد لکھے، جن سے سلطان محمد تغلق کے بعض دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں، محمد تغلق کے پاس ایک نہایت ہی حسین اور جمیل گلچہرہ نامی کنیز تھی، اس کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں آتا، لیکن چاچ نے ایک قصیدہ لکھ کر اس کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے،

بباغِ ملکت بمینم گلے ببار آید،　　کہ پیشِ عارضِ او ماہ شرمسار آمد،

زمہر مشتری اوشدم کہ آن مہ را،　　نجوم زیر دو یاقوت آبدار آمد،

کمند طرۂ او بر کنار لالۂ تر　　چو سنبلی ست کہ از باد بے قرار آمد،
(دانداں / ب)

خدنگ غمزۂ او در خم کمان ابرو　　ستارہ ایست کہ در ماہِ نو بکار آمد،

سواد خالِ رخش در بیاض دیدۂ من　　چو زنگی ست کہ بر طرفِ لالہ زار آمد

چو پستہ گشت دل شور بخت من بریان　　کہ تنگ شکر او لعل در نثار آمد

جشن شاہی، ایک بار سلطان نے دہلی میں جشن کیا تھا، بدر چاچ نے اس پر بھی ایک قصیدہ لکھا ہی اس جشن کی تاریخ اور تقریب معلوم نہ ہو سکی، بہر حال وہ قصیدہ یہ ہے:-

این جشن نیست مجلسِ فردوسِ اکبر ست　　کز فر عید و طلعتِ نوروز خوشتر ست

این اطلسِ مرصع نہ توسپہر نیست　　عکسِ فروغِ چترِ شہِ ہفت کشور ست

این تخت نیست قبہ عرشِ معظم است　　این شاہ نیست عیسیٰ ادریس مظہر ست

در مصر ملک یوسف موسیٰ مہابت　　بر قصر دین محمد جبریل چاکر ست

در زیر بال باز زر چتر آلِ شاہ　　ہفت آسمان زیک مگس سبز کمتر ست

صفہاے حاجبان کہ چو مژگان کشیدہ اند　　ہر صف ہزار اختر خورشید افسر ست

پیل است کوہ پیکر و شیہ است نفخ صور　　درگاہ شہ نمونہ صحراے محشر است

عید آمدہ براے تماشاے جشنِ شاہ　　بر در نشستہ طالب پروانہ در دست

خربزہ سلطان کے خربزے کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ لکھا ہے:-

شہنشاہِ زمان سلطانِ محمد،　　کہ از تیغش بود خور یک شرارہ

ہے تا در زراعت گاہ دنیا،　　بود چون خربزہ گردون دو پارہ

بہ شمشیر برہنہ شاہ خاور　　برون آید ز مشرق یک سوارہ

عدو چون خربزہ از تیغِ قہرش　　دو نیمہ باد وانگہ پارہ پارہ

ہے تا از مہ نو شب نماید　　چو خاتون جش بر دستِ یارہ

ہے تا صبحدم بر خوانِ گلریز،　　انداز جرم خور زرین عصارہ

نسل تغلق، ایک بات بدر چاچ کے قصیدوں میں کسی قدر کھٹکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے قصائد میں محمد تغلق کو بہرام کی نسل سے بتاتا ہے، اور اس کا وہ بار بار اظہار کرتا ہے، چنانچہ بعض قصائد کے اشعا

میں لکھتا ہے،

بہرام نسل رستم ادریس فضل عیسٰی — اقلیم بخش احمد کشور کشائے حیدر

شاہ اقلیم ستان خسرو بہرام نسب — اے پر تیر سحر زاغ کمانت را بال

قبہ چتر شاہ آلِ بہرام این زمان — بر سر ایوان ہفتم طارم کیوان رسید

اس سلسلہ میں خاندان تغلق کی تحقیق دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، تغلق کے معنی ترکی میں پہاڑی کے ہیں، نوادر المعانی میں تغلق کے معنی اوسط یا میانہ کے لکھے ہیں، فرشتہ طبقات ناصری کے حوالہ سے لکھتا ہے، کہ لفظ تغلق اصل میں قتلغ تھا، اہلِ ہند نے اس ترکی لفظ کو کثرت استعمال سے الٹ کر تغلق بنا دیا،[1] لیکن یہ توجیہ اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتی، شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے، کہ اس نے تغلق کا نسب نامہ "مناقب سلطان تغلق" میں لکھا ہے،[2] لیکن یہ "مناقب سلطان تغلق" مفقود ہے، اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا، ضیاء الدین برنی کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ تغلق کسی قوم یا قبیلہ کا نام نہیں تھا، بلکہ جیسا کہ سکوت سے بھی پتہ چلتا ہے، سلطان محمد تغلق کے باپ کا شخصی نام تھا، ملک تغلق نے جب خسرو خان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حمایت میں فتح پائی، تو غیاث الدین تغلق کے لقب سے مشہور ہو گیا، ابن بطوطہ کے بیانات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے، کہ "شیخ رکن الدین قریشی ملتانی سے میں نے سنا ہے، کہ تغلق قوم سے ترک قرونہ تھے"[4]

قرونہ سے مراد (جیسا کہ مارکو پولو نے لکھا ہے،) وہ لوگ تھے، جن کے باپ تاتاری تھے، اور ماں ہندی، یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے بیچ کے پہاڑوں میں رہتے تھے،[5] ابن بطوطہ کے اس بیان کی تصدیق اس کے معاصر مورخین سے نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس معاملہ میں بالکل خاموش ہیں، لیکن

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۳۰، [2] عفیف ص ۱۹ [3] برنی ص ۴۲۶ [4] ابن بطوطہ، ص ۸۶ [5] حواشی سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۸۵،

بعد کے مورخین نے اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ملک تغلق کی ماں ہندی تھی، چنانچہ فرشتہ میں ہے،:-

"دریں ملکے شہرتے دارد، کہ ملک تغلق پدر پادشاہ غیاث الدین تغلق شاہ در سلک غلامان بادشاہ غیاث الدین بلبن انتظام داشت، و با مردم جت (یا جٹ) کہ بوئے مملکت وصلت کردہ دختر از ایشان گرفت و بادشاہ غیاث الدین تغلق شاہ از و بوجود آمد،"[1]

خلاصۃ التواریخ کا مصنف سلطان محمد بن تغلق کے بارے میں لکھتا ہے،:-

"پدر سلطان ترک زاد و بنام تغلق از غلامان[2] سلطان غیاث الدین بلبن و مادر او از قوم جٹ پنجاب بود"

ملک تغلق کے بھائی کی شادی بھی ایک ہندو عورت سے ہوئی، جب تغلق ترقی کر کے دیالپور کے جنگی مرکز کا صوبہ دار مقرر ہوا، تو یہیں کے ایک زمیندار رانا مل بھٹی کی لڑکی سے اسکے بھائی کی شادی ہوئی، جس سے سلطان فیروز تغلق پیدا ہوا،[3]

مندرجۂ بالا تحریروں سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے، کہ تغلق ایرانی نسل سے نہ تھے، اس خاندان کا بانی غیاث الدین تغلق علاء الدین کے زمانہ میں سندھ آیا، اور کسی سوداگر کا گلہ بان ہو گیا، ان دنوں بادشاہ کا بھائی الغ خان سندھ کا حاکم تھا، تغلق اس کے زمرۂ خدام میں داخل ہو گیا، وہ پہلے پیادوں میں بھرتی ہوا تھا، الغ خان کو جب اوس کی شرافت معلوم ہوئی، تو اس نے اسکو سواروں میں ترقی دی، اس کے بعد اس کو افسر بنا دیا، پھر میراخور یعنی اصطبل کا داروغہ بنایا، اور ترقی کرتے کرتے آخر میں امرائے عظیم الشان میں ہو گیا،[4] اسکے بعد قسمت کی یاوری نے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا،

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۳۰، [2] فرشتہ بھی تغلق کو غیاث الدین بلبن کا نام بتاتا ہے لیکن ابن بطوطہ کے مقابلہ میں اوسکی روایت معتبر نہیں ہو سکتی، [3] عفیف ص ۳۶،۳۷،۳۸، [4] سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۸۶،

ان تاریخی حقائق کے بعد یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ تغلق ایران کے مشہور و معروف بہرام کی نسل سے تھے، تغلق خاندان کا یہ ایک ایسا روشن پہلو تھا کہ اس کے درباری مورخین مثلاً برنی اور عفیف اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، برنی کا اس باب میں بالکل خاموش رہنا اس امر کا بالواسطہ ثبوت ہے، کہ تغلق بہرام نژاد نہ تھے، رہ گیا بدر چاچ نے قصائد میں جو تغلق خاندان کو بہرام نسل سے بتایا ہے، اس کی حیثیت شاعرانہ مبالغہ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی، اور یہ بلا شک وشبہ کہا جا سکتا ہے، کہ تغلق باپ کی جانب سے تاتاری، اور ماں کی طرف سے ہندی تھے،

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ذاتی اخبار

"سچ" کے بجائے "صدق"

یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۲۷×۱۷/۴ ، ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم، گیارہ، اور اکیس کو شائع ہوتا ہے، ہم کو معلوم ہے کہ وہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص دلنشیں طرز صحافت کے لئے آپ کے اخبار "سچ" کے بند ہونے کے بعد سے بیتاب تھے، اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے، لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار "سچ" کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے، اس وجہ سے ہم فرداً فرداً خریداران سچ کو نمونہ نہ روانہ کر سکے، لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد از جلد روانہ فرما کر خریداروں کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرا لیں، ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہوں گے،

"صدق" ہر اعتبار سے "سچ" سے بڑھا ہوا ہو، معنوی حیثیت سے مضامین قرآن کا اضافہ، سالانہ چندہ للعہ ر پتہ حسب ذیل ہے،

منیجر اخبار "صدق" نمبر ۳۴ ہیوٹ روڈ لکھنؤ

نظمِ قرآن

از

مولوی امین احسن صاحب اصلاحی تلمیذ رشید مولینا حمید الدین فراہی مرحوم مصنف "نظام القرآن"

"یہ مضمون عربی رسالہ الضیاء (لکھنؤ) کیلئے لکھا گیا تھا، اور رسالہ مذکور کی جلد ۲ نمبر ۱ میں شائع ہو چکا ہے، آپ حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کے حکم سے میں نے اس کو اردو میں منتقل کر دیا ہے"

"امین احسن اصلاحی"

قرآن مجید کے اکثر طلبہ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات سے شیفتگی کے باوجود بعض اوقات نظم قرآن کے بارہ میں متشبہ ہو جاتے ہیں، کہ ان کے خیال میں مولانائے موصوف اس دعوی میں بالکل منفرد ہیں علمائے عرب وعجم میں سے جن لوگوں کو معارف قرآن پر غور کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، کوئی شخص بھی ان کا ہمنوا نہیں ہے، اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا تو یہ راز ان لوگوں سے مخفی نہ رہتا، جنکی دیدہ دری اور نکتہ رسی پر تمام امت کا اتفاق ہے، پھر کیونکر باور کیا جا سکتا ہے، کہ سلف کی نگاہ کشف وتحقیق جس حقیقت کا سراغ لگانے سے عاجز رہی، اس کا دروازہ ایک ایسے شخص نے کھول دیا، جو ان آخری صدیوں میں پیدا ہوا جبکہ علم وتحقیق کی تمام روشنیاں گل ہو چکی ہیں، اسلئے درحقیقت ائمہ سلف کے خلاف جو شخص نظم قرآن کا دعوی کرتا ہے وہ ایک ایسی بات کا دعوی کرتا ہے جسکے خلاف گویا تمام سلف کا اجماع ہے،

اس باب میں ان لوگوں کی سب سے بڑی عقلی ونقلی دلیل یہ ہے، کہ قرآن مجید بالکل کھلی ہوئی کتاب ہے، اسکے سمجھنے کیلئے کسی خاص ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، اس نے اپنا نام "کتاب مبین"، "سراج منیر" اور "نور" بتایا ہے، اور خداوند تعالیٰ نے اس کی تعریف ایسے لفظوں میں کی ہے، جن سے اس کا سہل اور آسان ہونا نہایت واضح لفظوں

میں ثابت ہوتا ہے، مثلاً فرمایا:-

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر، ہم نے قرآن مجید کو یاددہانی کیلئے آسان بنایا پس ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں متعدد ہیں،

پس اگر قرآن مجید میں نظم ہوتا جیسا کہ علامہ فراہیؒ کا دعوی ہے، تو لازماً یہ نظم بھی نہایت سہل الحصول ہوتا اور جس طرح ہر عربی دان بغیر کسی خاص کاوش کے اسکی آیتوں کا ترجمہ سمجھ لیتا ہے، اسی طرح ہر طالب نظم بادنیٰ تامل اسکے نظم کا بھی سُراغ لگا لیتا لیکن صورتِ واقعہ اسکے بالکل برعکس ہے نظم کی راہ نہایت دشوار ہے، سلف کی آہنی ہمتیں بھی اسکی مشکلات پر قابو نہ پا سکیں، اور دنیائے علم و تحقیق کے تمام فاتحین اس قلعہ کو مسخر کرنے سے عاجز رہے، اسلئے یہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ نظم کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ ایک مجاز ہے، جس کے پیچھے کسی لطائف پسند اور مو شگاف طبیعت نے اپنے تئیں محض زور آزمائی اور جولانی کے شوق میں ڈال دیا ہے، اور اسطرح ایک لایعنی سعی میں جو شریعت اسلام میں ممنوع ہے، الجھ کر رہ گئی ہے،

استاذ مرحوم نے مخصوص اس موضوع پر دلائل النظام[1] کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ایک ایک خدشہ سے تعرض کیا ہے، اور تمام دعاوی پر اپنے اصول کے مطابق، نہایت محکم اور قطعی دلیلیں قائم کی ہیں، لیکن اس قسم کے اہم مباحث پر اس مختصر مضمون میں اطمینان بخش تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، البتہ اس موضوع سے متعلق چند باتیں جو استاذ مرحوم کے خطبات درس میں سے حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں، اختصار کیساتھ پیش کیجاتی ہیں،

یہ بات اصول کی حیثیت سے پیش نظر رکھنی چاہئے، کہ اس باب میں ہمارا اصلی اعتماد نفس قرآن پر ہے، وہ بہتر سے بہتر صورت میں منظم ہے، یہ نظم بعض مخصوص مقامات کے علاوہ ایک صاحبِ نظر کے لئے ہر جگہ بالکل واضح ہے

[1] خدا کا شکر ہے کہ مخدومی جناب ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب سول سرجن بارہ بنکی، اور مولوی حفیظ احمد خان صاحب بی اے منصف حیدرآباد دکن کی توجہ سے مولینا کی تصنیفات کی طبع و اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، امید ہے کہ یہ کتاب بھی ناظرین کے ہاتھوں تک پہنچ سکے گی (امین احسن اصلاحی)

جن مقامات پر حجاب ہے، وہاں ہم قرآن کے بجائے اپنی نگاہ کو متہم کرتے ہیں، نظم قرآن پر ہمارا عقیدہ خارجی دلائل پر قائم نہیں ہے، بلکہ اس کی بو ہم نے خود قرآن میں سونگھی، اور یہی ہمارے پہلے قدم کی محرک ہوئی،

لیکن ان تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ قرآن کے علاوہ جو بعض خارجی دلائل ہیں، وہ مضطرب طبیعتوں کے اطمینان کے لئے ذیل میں اجمالاً پیش کئے جاتے ہیں،

۱- سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ دعوے نظم میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ علمائے سلف کی ایک جماعت کا پہلے سے یہ مسلک رہا ہے، اور اس پر انھوں نے کتابیں لکھی ہیں، علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں،

"علامہ ابو جعفر بن زبیر شیخ ابوحیان نے نظم پر ایک خاص کتاب لکھی، اور اس کا نام البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن رکھا، اور ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین البقاعی کی تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور اسی اصول پر لکھی گئی ہے"،

اس کے بعد انھوں نے خود اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، جس میں نظم کے علاوہ وجوہ اعجاز پر بھی بحث کی ہے، پھر لکھتے ہیں:-

"ترتیب و نظم کا علم ایک اعلیٰ علم ہے، لیکن اسکے اشکال کی وجہ سے مفسرین نے اسکی طرف بہت کم توجہ کی، امام فخر الدین کو اس کے ساتھ سب سے زیادہ اعتنا رہا، اور انکا قول ہے کہ لطائف قرآن کا اصلی خزانہ نظم و ترتیب میں چھپا ہوا ہے"،

امام رازیؒ آیۃ ولو جعلناہ قرآناً اعجمیاً لقالوا الخ (حم السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس آیت کے سببِ نزول کے بارہ میں لوگ روایت کرتے ہیں کہ کفار نے ازراہ شرارت کہا کہ اگر قرآن کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا، تو بہتر ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو جواب دیا ہے لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک، کتاب الہی پر سخت ظلم ہے، اسکے معنی یہ ہوئے کہ قرآن مجید میں ایسی آیتیں اتری ہیں، جن میں باہمدگر کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ قرآن مجید پر سب سے بڑا طعن ہے، ایسی

صورت میں قرآن مجید کو معجز ماننا تو الگ رہا، اسکو ایک مرتب و منظم کتاب کہنا بھی مشکل ہے، صحیح مسلک میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے آخر تک بالکل مربوط کلام ہے (اسکے بعد تقریبًا اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر لکھی ہے، پھر لکھتے ہیں) ہر مصنف، جو انکار حق کا عادی نہیں ہے، تسلیم کریگا کہ اگر سورہ کی تفسیر یوں کی جائے، جس طرح ہم نے لکھی ہے، تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی، اور اسکی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرین گی"

(دیباچہ تفسیر نظام القرآن فراہی)

اس سلسلہ کی ایک اہم شخصیت، علامہ مخدوم مہائی ہین، ان کی تفسیر آیات کی باہمی مناسبت کے بیان میں ہے، اور اس چیز کی ان کی نظر میں اس درجہ وقعت تھی، کہ اپنی کتاب کا نام انھون نے تبصیر الرحمان و تیسیر المنان رکھا،

اسی عقیدہ کے ایک بزرگ علامہ ولی الدین ملوی ہین، وہ فرماتے ہین:-

جو لوگ خیال کرتے ہین، کہ قرآن مجید کا نزول باقتضاے حالات جستہ جستہ ہوا ہے، اسلئے آیات میں باہمی تعلق نہیں تلاش کرنا چاہئے، ان کو سخت دھوکا ہوا، بلاشبہہ قرآن مجید کا نزول حسب حالات جستہ جستہ ہوا، لیکن اسکی ترتیب میں نہایت گہری حکمت مضمر ہے"

یہ وہ علمائے امت ہین جنھون نے نظم کی بو سونگھی ہے، ان کے اقوال پیش نظر رکھو، بعینہ یہی حال علامہ ابن جریر وغیرہ کا ہے، باوجودیکہ ان کا خاص مقصد صرف روایات سلف کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں جمع کر دینا ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے، کہ وہ تمام اقوال سلف میں سے اس قول کو ترجیح دیدیتے ہیں، جو نظم کلام اور سیاق وسباق سے زیادہ لگاؤ رکھتا ہے، اور دوسری روایات جو اس سے مانع ہوتی ہیں، ان کی ذرا پروا نہین کرتے، بالکل یہی طریقہ علامہ زمخشری رح کا ہے، وہ بھی تمام موانع سے بے پروا ہو کر صرف نظم کا تتبع کرتے ہین اور اگر بعض جگہ حمایت اعتزال کے جوش میں وہ آگے نہ بڑھ جاتے، تو میرا خیال ہے کہ ان کی کتاب اس فن

کے مبتدیون کے لئے نہایت مفید ہوتی یہی بات حضرت امام رازی کی تفسیر میں بھی ہے، وہ اشعریت کے علمبردارون مین ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسکی حمایت کے جوش میں کہیں سے کہیں جا نکلتے ہین،

اوپر جن مفسرین کا تذکرہ ہوا ہے، وہی ائمۂ التفسیر ہین، اور انہی کی کتابیں اس فن کی امہات ہین، وہ سب لوگ نظم کو تسلیم کرتے ہین لیکن بعض وجوہ سے جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں یہ لوگ نظم کو پوری طرح بے نقاب نہ کر سکے، باقی رہی یہ بات کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھون نے اپنی کتاب الفوز الکبیر مین نظم کا انکار کیا ہے، تو یہ بات بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے، ایک ایسے قول کی بنا پر جس کی تاویل اسکے علاوہ بھی آسانی سے ہو سکتی ہے، جو باول دہلۂ ذہن کے سامنے آتی ہے، میں ایسے بلند رتبہ امام سے بدگمانی نہیں پسند کرتا، علما، کی جماعت میں ٹھیک بات قبول کرنے میں وہ سب سے آگے ہیں، اپنی تصنیفات خصوصًا حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے جو اسرار و حکم انھون نے بیان کئے ہین، وہ اس بات کے شاہد ہین کہ معرفت نظم مین ان کا مقام بہت بلند تھا، پھر ابن العربی کے ساتھ ان کو جو حُسن ظن ہے، وہ سب کو معلوم ہے، اور نظم کے بارے مین ابن العربی اہل علم سے پوشیدہ نہین، اس لئے ضروری ہے کہ اس بارہ میں ان کے کلام کی ایسی تاویل کیجائے، جو ان کی شان اور ان کے رجحانات کے مطابق ہو، اور یہ بات آسانی سے ممکن ہے، اس باب میں انھون نے جو کچھ کہا ہے، اسکے مختلف پہلو ہین، اگر ہم کو ایک غیر متعلق بحث میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا، تو ہم تفصیل سے دکھاتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہین،

جو علما نظم کے منکر ہین، وہ بھی بادل ناخواستہ منکر ہین، کیونکہ اس خیال کی بنیاد محض اس بات پر ہے کہ قرآن مجید حالات کے لحاظ سے جستہ جستہ اترا ہے، اس بنیاد کا ضعف بالکل ظاہر ہے، کیونکہ بعض طوال اور اکثر قصار پوری پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہین، نیز بعض سورتوں کا نظم بالکل واضح ہے، اور احادیث سے ثابت ہے کہ آیات کی ترتیب میں آنحضرت صلعم مناسبت کا لحاظ فرماتے تھے، انہی وجوہ کی بنا پر امام رازی نے وہ بات کہی ہے جو اوپر گذر چکی ہے، اور سورہ انعام کی تفسیر میں انھون نے اپنے خدشہ کو بالکل صاف صاف

ظاہر کر دیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ نظمِ قرآن کے منکر علما کا انکار کرنا بھی ان کی دینی غیرت پر مبنی تھا، انھوں نے خیال کیا کہ نظم کا دعویٰ کرنا اور پھر یہ اعتراف کرنا کہ وہ اکثر یا بعض سورتوں میں مخفی ہے، قرآن کے حق میں مضر ہے، اس سے معاندین کو اس پاک کتاب پر نکتہ چینی کی جرأت ہوگی، اس خیال کی بنا پر وہ ایک ایسی بات کہہ گئے جس کا ضرر اس کے فائدہ سے زیادہ ہے، لیکن اعمال کا مدار نیت پر ہے، انشاء اللہ وہ آخرت میں اپنے حسنِ نیت کا اچھا صلہ پائیں گے

۳- جن لوگوں نے جمع و ترتیب قرآن سے متعلق روایات پر غور کیا ہے، وہ واقف ہیں کہ قرآن کریم جستہ جستہ نازل ہوا ہے، لیکن آیات کی ترتیب آنحضرت صلعم کے حکم کے مطابق ہوئی ہے، آپ آیات کی جگہ سورتوں میں متعین فرما دیتے تھے، اور کاتبین وحی ان کو ان کی متعینہ جگہوں میں رکھتے تھے، اسی وجہ سے ترتیب آیات کے توقیفی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے، اگر قرآن مجید میں نظم نہ ہوتا، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے، تو آنحضرت صلعم اس قسم کا حکم کیوں دیتے، ؟ اور اگر کوئی عظیم الشان حکمت داعی نہ ہوتی، تو نزولی ترتیب کو چھوڑ کر جو سب سے زیادہ قابلِ لحاظ تھی، ایک نئی ترتیب کیوں اختیار فرماتے، ؟ بہر حال جب ہر آیت کیلئے ایک مخصوص جگہ متعین ہوئی، تو لازماً اس تعین کے سبب پر غور کرنا پڑے گا، اور ظاہر ہے کہ بجز رعایتِ نظم کے اس کا کوئی اور سبب نہیں بتایا جا سکتا، اس لئے جو لوگ ایک سورہ کے مضامین میں بھی ربط و نظام کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال صحت پر مبنی نہیں، علامہ ملویؒ نے جن کا قول اوپر گذر چکا ہے، اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے

ہمارے خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جن آیات میں کسی سابق حکم کی تخفیف وارد ہوئی ہے، ان کو ہمیشہ سابق حکم کے پہلو میں جگہ دی گئی ہے، مثلاً آیۂ الآن خفف اللہ عنکم وعلم الخ ماسبق آیت کے بہت بعد نازل ہوئی ہے، لیکن چونکہ اس میں اسی سابق حکم کی تخفیف تھی، اس لئے اس کو اسی کے بعد رکھا گیا، اسی طرح سورہ مزمل کی آخری آیت ایک مدت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس کو بھی پہلے حکم کے بعد ہی رکھا گیا، یہی حال آیۂ والذین یتوفون منکم الخ اور آیۂ احل لکم لیلۃ الصیام الخ کا ہے، بعض جگہ جہاں اس قاعدہ کے خلاف ہوا ہے، اس کے اسباب دوسرے ہیں، ایسے مواقع پر زیادہ تر

عمود یا بعض دوسرے مصالح کی رعایت کی گئی ہے، جو اس قسم کی تبدیلی کے مقتضی ہوتے ہیں، لیکن جب تک کوئی شخص ان تغیرات کو سمجھ لینے کا عادی نہ ہو جائے، وہ جزئیات سے اصول تک نہیں پہنچ سکتا،

۴- علٰحدہ علٰحدہ سورتوں کا قائم کرنا، اور ان کا چھوٹا بڑا ہونا بھی نظم کی دلیل ہے، اگر قرآن مجید غیر منظم ہوتا تو الگ الگ سورتیں قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی، ؟ اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہو کہ سورتوں کی تحدید وحی الٰہی سے ہوئی ہے، کوئی عقلی یا نقلی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے، جن لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے ان کے پاس قرآن مجید یا حدیث صحیح کی کوئی سند نہیں ہے، اسلئے ان کا دعویٰ بے بنیاد ہے، ہر صاحبِ عقل محسوس کرتا ہے کہ الگ الگ سورتیں قائم کرنا، اور ان کا مختلف المقدار ہونا اس امر کا صاف ثبوت ہے، کہ سورتوں کے مضامین الگ الگ ہیں، نیز ہر سورہ کسی مخصوص وحدانیت کی حامل ہے، جو اس کو دوسری سورتوں سے ممتاز کرتی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو جامعین قرآن آیتوں کے مجموعے لیتے، اور برابر برابر سورتوں میں رکھتے چلے جاتے، تسہیل تلاوت، حفظِ قرآن اور دوسرے مقاصد کے لئے یہ ترتیب اور بھی آسان ہوتی،

۵- سورتوں کی موجودہ ترتیب، جو بالاتفاق تمام مصاحف میں پائی جاتی ہے، وجودِ نظم کی بہت بڑی دلیل ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ہے، وہ بلا سبب نہیں ہو سکتی، ظاہر ہے کہ اس کے لئے سورتوں کی مقدار سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز تھی لیکن اس کا لحاظ، ہر شخص کو معلوم ہے، قرآن مجید میں بالکل نہیں ہے، کیونکہ ترتیب میں سورہ فاتحہ کو بقرہ سے پہلے جگہ دی گئی ہے، اور سورہ کوثر جو قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ ہے، متعدد اس سے بڑی سورتوں سے پہلے رکھی گئی ہے، یہ بھی مسلم ہے کہ یہ ترتیب نزولی نہیں ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس تقدیم و تاخیر کا کوئی اور سبب تلاش کیا جائے، ہمارے نزدیک رعایتِ نظم کے سوا اس کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا، ممکن ہے کہ اس پر یہ اعتراض کیا جائے، کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کی رائے سے ہوئی ہے، پیغمبر صلعم کے حکم سے نہیں ہوئی ہے، لیکن یہ بات قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے بالکل خلاف ہے، استاذ امام رحمہ نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں اسکی مدلل تردید کی ہے، اسلئے یہاں اس پر مفصل

بحث کی ضرورت نہیں ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلو کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کی رائے سے ہوئی، اس سے یہ کیونکر ثابت ہو گیا، کہ انھوں نے نظم کی کوئی پروا نہیں کی، اور بلا لحاظ ربط و تعلق سورتوں کو جمع کردیا، ہر شخص کو معلوم ہے کہ سورۂ براۃ کے بارہ میں جب صحابہ میں اختلاف ہوا، کہ اس کو کس جگہ رکھا جائے، تو یہ گتھی نظم ہی کی مدد سے سلجھی، اور معنوی مناسبت کی رعایت سے اسکو انفال کے بعد جگہ دی گئی، یہ بات عام خیال کے لحاظ سے کہی گئی ہے، ورنہ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں، سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، اور قرآن مجید ہمارے اس دعوے پر حجت ہے،

سورۂ قیامہ میں ہے:۔

ان علینا جمعه و قرآنه فاذا	بیشک ہمارے اوپر ہے اس (قرآن) کا جمع کرنا
قرآناه فاتبع قرانه ثم ان علینا	اور پڑھنا پس جب ہم پڑھ چکیں، تو اس پڑھے
بیانه۔	ہوئے کی پیروی کرو، پھر ہمارے اوپر ہے، اس
	کی تشریح کرنا،

استاذ امام مذکورہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں، :۔

"اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید عہد نبوت ہی میں جمع ہو کر آنحضرت صلعم کو ایک خاص ترتیب سے سنا دیا جائے گا، کیونکہ یہ وعدہ اگر آپ کے بعد پورا ہونے والا ہوتا، تو آپ کو اس جمع و ترتیب کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، دوسری یہ کہ اس قرأت ثانیہ کے مطابق جو جمع کے بعد ہوئی آپ کو قرآن مجید سنانے کا حکم ہوا، اور عقلاً و نقلاً ناممکن ہے کہ پیغمبر کے پاس کوئی حکم آئے اور وہ اس کو امت تک نہ پہنچائے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ، اس حکم عام کا مقتضیٰ ہے کہ پیغمبر صلعم نے اس قرأت اخیرہ کے مطابق جو لوح محفوظ میں ہے، امت کو قرآن مجید کی تعلیم کی ہو، اور آخری قرأت کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے، تیسری بات یہ ہے کہ اس جمع و ترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو تعمیم و تخصیص اور تکمیل و تخفیف چاہی، وہ بھی فرمادی، قرآن مجید ان تینوں مراحل سے عہد نبوت ہی میں گذر گیا، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے تھے، اور یہ بغیر اس کے ناممکن ہے، کہ قرآن مجید ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کو سنایا گیا ہو، اسی ترتیب کے مطابق صحابہ نے آپ سے قرآن مجید سیکھا، آپ آیات کو مناسب جگہوں میں رکھنے کا حکم دیتے تھے، اور اس حکم کی تعمیل کیجاتی تھی، اگر کوئی تشریحی آیت اترتی، وہ مناسب جگہ میں شامل کردیجاتی، اس طرح جب پورا قرآن مجید مکمل ہو گیا، تو حضرت جبرئیل نے جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے، آخری مرتبہ پورا قرآن مجید سنایا، ..... اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد نظام کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں"

(تفسیر سورۂ قیمہ مصنفہ فراہی)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی جو ترتیب ہمارے زمانہ میں موجود ہے، یہ وحی الٰہی کے مطابق عہد نبوت ہی میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن چونکہ اس عہد کی دنیا لوازم تمدن سے محروم تھی، پڑھنا لکھنا شاذ و نادر اور کاغذ وغیرہ ناپید تھا، اسلئے ایک عرصہ تک قرآن مجید کھجور کے پتوں، ہڈیوں، تختیوں، اور حفاظ کے سینوں ہی میں رہا، حضرت ابوبکر رض پہلے شخص ہیں جنھوں نے منتشر آیات کو ایک مصحف میں محفوظ کیا، اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسکی متعدد نقلیں کرا کے تمام ممالکِ اسلامیہ میں بھجوائیں،

۶۔ چھٹا پہلو یہ ہے کہ کسی کلام کی اصلی روح نظم ہے، اسکے الگ کردینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ کلام اپنی بعض خوبیوں سے محروم ہو جائیگا بلکہ پورا کلام بالکل مہمل اور بے معنی ہو جائیگا جو کلام نظم سے خالی ہو وہ از قسم خرافات ہے کوئی عاقل اپنا ایک لمحہ بھی اس پر ضائع کرنا پسند نہیں کریگا، قرآن مجید کی نسبت تمام دنیا کو معلوم ہے کہ اس نے عربوں کو تحدی کی اور عرب باوجودیکہ ان کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا، اس کے جواب میں ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بھی نہ پیش کر سکے، قرآن کی اس جلالت کے لحاظ سے اس میں سب سے پہلے جو چیز ہونی چاہئے، وہ نظم ہے، کیونکہ ایک ایسی کتاب جو سب سے

زیادہ منتشر اور بے نظم خیال کیجاتی ہو ایک لمحہ کے لئے بھی قابل تحدی نہیں ہو سکتی نہیں سے ایک اور نکتہ کی طرف رہبری ہوتی ہے، کہ قرآن مجید نے جہان کہین تحدی کی ہے، اپنے مثل ایک کتاب، یا دس سورت یا بحدیث من مثلہ یا کم از کم ایک سورۃ کا مطالبہ کیا ہے، ایک آیت سے تحدی نہیں کی ہے، کیونکہ ایک مفرد آیت کتنی ہی عظیم الشان علم و حکمت کی حامل کیون نہ ہو، تحدی کے قابل نہیں ہو سکتی، متفرق آیات کی مثال قیمتی موتیون یا شیرین الفاظ کی ہے جنکو کسی صفحہ پر تم نے بکھیر دیا ہو، انکے آب و رنگ سے تم محظوظ ہو سکتے ہو لیکن انکو ایسے شخص کے سامنے مقابلہ کیلئے نہیں پیش کر سکتے جس نے اپنے قیمتی موتیون کو کسی رشتہ میں اور اپنے شیرین الفاظ کو کسی عمدہ نظم یا نثر میں پرویا ہو کیونکہ اُس نے انکے ذاتی آب و رنگ پر نظم و ترتیب کا اضافہ کرکے ان کے حسن کو دوبالا کر دیا، اسی وجہ سے عرب و عجم کے تمام علماے بلاغت کا اتفاق ہے، کہ کلام کی اصلی روح نظم ہے، اسی سے اس کی تمام خوبیان ظہور میں آتی ہیں، اگر کسی شخص کو اس کے باور کرنے مین تامل ہو، وہ کسی بلیغ سے بلیغ خطیب کا کوئی کلام لے، اور اس کو اس کے نظم کے شیرازہ سے الگ کر دے، وہ دیکھے گا کہ کلام کا تمام حسن و جمال دفعۃً برباد ہو گیا، پس ایک پوری سورۃ جو ایک مخصوص وحدانیت کی حامل ہو اپنے اندر دو حسن رکھتی ہے، ایک اس کے اجزا کا حسن ہے، دوسرا نظم کا، نور علی نور، ویہدی اللہ لنورہ من یشاء

۷۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کو شعر و شاعری سے منزہ قرار دیا ہے،

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ۔ اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہین دی ہے، اور نہ یہ چیز اسکے لئے زیبا ہے،

دوسری جگہ ہے۔

وما ھو بقول شاعر، اور یہ قرآن مجید کسی شاعر کا کلام نہیں ہے،

اور شاعرون کا ایک بہت بڑا عیب یہ بتایا ہے، کہ انھم فی کل واد یھیمون، وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں، یعنی جو خیال سامنے آگیا، بے سوچے سمجھے اسی سے مشغول ہو گئے، اس قسم کی بے تکی ہرزہ سرائی شعراء کی خصوصیت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کو اس عیب سے منزہ قرار دیا ہے، اس لئے

قرآن مجید کو غیر منظم خیال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو تبیان تعبیر کیا ہے، اقتضاب یعنی بے نظمی اسی کی ایک شاخ ہے، یہیں سے ان لوگون کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے، جو قرآن مجید کو اس بنا پر بے نظم خیال کرتے ہین، کہ وہ شعراے عرب کے کلام کے انداز پر ہے، کیونکہ قرآن مجید نے ان کے کلام کی صرف خوبیان لی ہین انکے معائب سے آلودہ نہیں ہوا ہے، نیز یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے، کہ اہل عرب کا کلام صرف شاعری ہی نہیں تھا، یہ ان کے کلام کی صرف ایک قسم ہے، اور شرفاے عرب عموماً اس کو وقار کے منافی سمجھکر اس سے احتراز کرتے تھے، ان کے شوق و رغبت کی اصلی چیز خطبات ہوتے تھے، اور جو لوگ ان کے کلام کی اس صنف سے واقف ہیں، وہ اعتراف کرین گے، کہ خطبات عرب جملہ محاسن کلام کے حامل ہوتے تھے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ مٹ گیا، اور بہت تھوڑا حصہ آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے،

۸۔ قرآن کی بعض سورتوں میں ترجیعات ہین، مثلاً سورہ رحمان مین فبای آلاء الآیہ والی آیت بار بار دہرائی گئی ہے، اسی طرح سورۂ مرسلات میں ویل یومئذ للمکذبین، اور سورۂ شعراء میں ان فی ذلک لآیۃ الآیہ کی تکرار ہے، اسی طرح بعض سورتوں میں ہر چند آیات کے بعد، کوئی آیت مطلع یا مقطع کی حیثیت سے بار بار آتی ہے، مثلاً سورۂ نور میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھ، "وانزلنا فیھا آیات بینات لعلکم تذکرون" تین مرتبہ وارد ہے، تعجب ہے کہ ان سورتون کے اجزا، کو کیونکر بے نظم کہا جا سکتا ہے، جبکہ باعتبار ترجیع یہ بالکل متحد معلوم ہوتے ہین، اس باب کا ایک باریک نکتہ یہ ہو کہ قرآن مجید کی ہر سورۃ میں کلام بار بار عمود یا مرکزی طرف لوٹتا ہے، لیکن مقام کی رعایت سے الفاظ مین ایسی تبدیلی یا کمی بیشی ہو جاتی ہے، کہ مبتدی جو قرآن کی ان اداؤن سے نا آشنا ہے، سررشتہ نظم کو نہیں سنبھال سکتا، بلکہ اگر مجھ پر غلو کا الزام نہ لگایا جائے تو یہ کہنے کی جرأت کیجا سکتی ہے کہ ترجیعات تمام قرآن میں پائی جاتی ہین، اور ان کی دو قسمین ہین لفظی اور معنوی، لفظی کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، معنوی ترجیعات کے متعلق یہ بات خیال میں رکھنی چاہئے، کہ معرفت نظم کا زیادہ تر نظام انہی پر ہے، لیکن بغیر ممارست ان کا تتبع مشکل ہے، یہان یہ بات بھی ظاہر کر دینی چاہئے، کہ مجھکو نظم کا یقین سب سے زیادہ ترجیعات

ہی کی رہنمائی سے ہوا، جب میں ترجیعات والی سورتون کی تلاوت کرتا ہون، ظاہری اقتضاب کے باوجود مجھکو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا کسی تیرانداز نے اپنے ترکش کے تمام تیر اپنے سامنے پھیلا دیئے ہین، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک مخصوص نشانہ کی طرف ان میں سے ایک تیر اٹھا کر پھینک دیتا ہے،

۹- قرآن مجید میں قوافی کی رعایت کی گئی ہے، اس سے بھی نظم کا ثبوت ملتا ہے، جن لوگون نے کبھی اس پہلو سے قرآن مجید پر غور کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی مدد سے نظم کے کن نکتوں تک پہنچا جا سکتا ہے یہان مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے، البتہ اتنی بات ذہن میں رکھنی چاہئے، کہ قرآن مجید کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہونے کے باوجود اس میں قافیہ کی رعایت اقتضاب کے بالکل منافی ہے کیونکہ قافیہ کا ظاہری اتصال ارتباط و تعلق ہے، اور کوئی عقلمند انسان ایک لحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتا، کہ قرآن مجید کے جستہ جستہ نازل ہونے کی وجہ سے اس کے اجزا میں کوئی نظم نہ پیدا ہو سکا، لیکن اللہ تعالیٰ یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نغمہ یا سجع کی حفاظت کے خیال سے اس کے قوافی کی رعایت باقی رکھی، سجع و قافیہ کلام مین مقصود بالذات چیزین نہیں ہیں کہ ان کے لئے اس درجہ اہتمام کیا جائے، اسلئے اگر قرآن مجید کا جستہ جستہ نازل ہونا فساد نظم کا باعث ہوتا، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، تو اس کا سب سے زیادہ اثر قوافی پر پڑتا، حالانکہ وہ تمام سورتون میں بالکل محفوظ ہین،

تفسیر سورۂ فیل، (عربی)

مولانا حمید الدین نظام القرآن کے نام سے عربی میں جو تفسیر لکھ رہے تھے، اور جس کے بعض اجزا انکی زندگی ہین چھپ گئے تھے، اب اس کا ایک نیا حصہ تفسیر سورۂ فیل چھپ کر شائع ہوا ہے، جو لوگ اس سلسلۂ تفسیر کی اہمیت سے واقف ہین، وہ جانتے ہین، کہ اس مہتم بالشان سورہ کی تفسیر مین مصنف مرحوم نے کیا کیا حقائق بیان کئے ہون گے،

قیمت:- ۸ر لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ،

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

پولینڈ میں اسلامی آرٹ کا اثر

رسالہ آرس اسلامیکا (امریکہ) جلد ۲ حصہ اول میں عنوان بالا سے تادیوز مانکوسکی کا ایک پر معلومات مضمون چھپا ہے، اسکی تلخیص حسب ذیل ہے:-

پولینڈ میں اسلامی آرٹ کا اثر براہ راست نہیں آیا، بلکہ اس تجارت کے ذریعہ رونما ہوا جو پولینڈ خصوصاً اس کی جنوبی مشرقی سرحد کے دو شہروں لواؤ اور کیمنیک پوڈولسکی (Kamieniec Podolski) اور بحر اسود کی جنیوی نوآبادیوں کے درمیان سرگرمی سے قائم تھی، ان میں کفا (Kaffa) واقع کریمیا سب سے زیادہ اہم تھی، دوسرا ذریعہ پولینڈ اور اسلامی ممالک کے درمیان صنعتی تعلقات کے قائم کرنے کا وہ آرمینی گروہ تھا، جو نقل مکان کر کے تیرھویں صدی عیسوی میں لواؤ میں جا کر آباد ہو گیا تھا، ان لوگون نے اپنے قدیم ایشیائی مسکنون سے تعلقات باقی رکھے، اور اپنے وطن سے بہتیری ترکی اور ایرانی چیزین لا کر پولینڈ میں رائج کر دیں، یونانیون نے جو پولینڈ مین جا کر آباد ہو گئے تھے، ایشیائی تجارت میں بہت کم حصہ لیا، بہرحال آرمنی اور یونانی جو چیزین پولینڈ میں لائے، ان میں صرف مشرقی ظروف، زربفت اور اسلحہ نہ تھے، لواؤ اور کیمنیک پوڈولسکی میں پہنچکر آرمینی معمارون اور سنگ تراشون نے چودھویں صدی کے وسط میں جو گرجے تعمیر کئے، ان کو اسلامی آرٹ کے مطابق آراستہ کیا، جب آرمینیا ترکون اور ایرانیون کے ہاتھون فتح ہو گیا، تو آرمینی سنگ تراشون اور نقاشون نے اپنے فاتحین کا مذاق تعمیر اختیار کر لیا اور عمارتوں کی آرائش میں سلجوقی اور بعد کے ترکی نمونوں کی پیروی کرنے لگے،

سولھوین اور سترہوین صدی میں پولینڈ اور اسلامی ممالک کے سیاسی اور تجارتی تعلقات میں قرون وسطیٰ کے تعلقات کی نسبت ایک کامل تغیر واقع ہوا، پولینڈ کی تجارت نے ترقی کی، اور یورپ میں ترکوں کی فتوحات کی وجہ سے دونوں مملکتوں کی سرحدیں قریب تر ہوتی گئیں، قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جب ۱۴۸۴ء میں ترکون نے کفہ پر بھی قبضہ کرلیا، تو تجارتی راستے بھی بدل گئے، جینوا کی بحری باربرداری کی تجارت گر گئی، اور خشکی کا راستہ جو لواؤ اور وہان سے پولینڈ کے اندر سے ہوتا ہوا بحر بالٹک تک اور پھر شمالی اور مغربی یورپ کو جاتا تھا، بہت اہم ہوگیا، پولینڈ ترکی اور ایرانی مال کی ایک نہایت اہم منڈی بن گیا،

پولینڈ کی مشرقی سرحدون پر جو نام نہاد ایشیائی تاجر آباد تھے، ان میں ترک یونانی، اور آرمینی ہر قوم کے لوگ تھے، آرمینی زیادہ تر ایران سے تجارت کرتے تھے، اور وہان سے مشرقی ظروف لایا کرتے تھے، پولینڈ کے بادشاہ لواؤ کے آرمینی باشندون کو اصفہان، کاشان، اور ایران کے دوسرے شہرون میں جو سترہوین صدی میں زربفت کی صنعت کے لئے مشہور تھے، بھیجا کرتے تھے، اور ان کے ذریعہ زربفت قیمتی اسلحے اور خیمے وغیرہ منگاتے تھے، پولینڈ کے تاجر جن چیزوں کی تجارت کرتے تھے، ان کی فہرست مین بڑی تعداد ایرانی قالینون کی ہے، خصوصًا وہ جو ریشم اور سونے کے تارون سے بنائے جاتے تھے، یہی وہ ایرانی قالین ہیں جو پولش طرز کے کہے جاتے ہیں، اعلیٰ خاندانوں میں لوگوں کی وفات پر متروکات کی جو فہرست تیار کی جاتی تھی اسمین بھی ایسے قالینوں کا ذکر اکثر آتا ہے، پولینڈ کے ایرانی قالینون میں بہتیرے ایسے تھے، جن میں پولش خاندانوں کے خاندانی نشان سونے کے تارون سے بُنے ہوئے تھے، یہ قالین ایرانی یا ترکی کارخانون میں پولینڈ سے بھیجے ہوئے نمونون کے مطابق تیار کئے گئے تھے،

۱۶۴۳ء کے قریب پولینڈ کے ایک بڑے فوجی سردار استانسلا کونیک پولسکی (Stanisl. Koniecpolski) نے فلانڈرس کے مشہور کاریگرون کو اس غرض سے بلایا کہ اطالوی زربفت کے نمونہ کے مطابق اپنے ملک میں بھی ریشمی اور اونی زربفت کے کارخانے قائم کرے، لیکن چونکہ اٹلی اور

اسپین سے کچا مال لانے میں دقتیں پیدا ہوئین اسلئے اُس نے مشرق کی جانب توجہ کی، اور ترکی ممالک سے زربفت کچا مال منگوایا، بلکہ بننے والے بھی بلوائے، یہ بننے والے زیادہ تر یونانی تھے، ان کاریگرون کے آنے کے بعد برووڈی (Brody) میں جو کارخانے قائم ہوئے، ان میں اطالوی نمونہ کے زربفت کے بجائے بالکل ایرانی طرز کے زربفت اور قالین بُنے جانے لگے، انہی کاریگرون میں سے ایک نے لواؤ میں مشرقی طرز کے کمخواب بننے کے کارخانے بھی قائم کئے، ان کارخانون میں اس نے وہان کے بہتیرے باشندوں کو بھی اس صنعت کی تعلیم دی، سترہوین صدی کے وسط میں لواؤ نے مشرقی طرز کو اختیار کرنے کا قطعی طور پر فیصلہ کرلیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطالوی زربفت کی بڑی بڑی کوٹھیاں ۱۶۴۹ء میں بیٹھ گئیں، اب اطالوی زربفت کی جگہ مشرقی زربفت نے لے لی، جو لواؤ سے نکل کر تمام پولینڈ اور پھر مغربی یورپ میں پھیل گیا،

اسی زمانہ کے وہ قالین بھی ہیں جو مختلف عجائب خانون میں نظر آتے ہیں اُن پر اسلامی آرٹ کے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، لیکن اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ وہ پولینڈ ہی میں بنے ہیں، علاوہ اور باتون کے خود ان میں بھی وہ مشرقی قالینون سے مختلف ہیں ان کی زمین بھیڑ کے بغیر رنگے ہوئے اون کی ہے جو مشرقی قالینون کے اون سے مختلف ہے رنگوں میں بھی زیادہ تر نیلے اور سبز رنگ ملتے ہیں، اور ایرانی قالینوں کا شوخ سرخ رنگ بہت کم نظر آتا ہے، اکثر قالینون میں صرف دو ہی رنگ پائے جاتے ہیں، ہلکا بادامی، اور بھیڑ کا بغیر رنگا ہوا سیاہ اون، اگرچہ یہ قالین اسلامی اور زیادہ تر ایرانی صنعت کے مطابق بنائے گئے ہیں، تاہم ایک مبصر انھیں دیکھ کر بتا سکتا ہے، کہ یہ اسلامی ممالک کے باہر کے بنے ہوئے ہیں نقش و نگار کے طرز میں بھی بحیثیت مجموعی مشرقی قالینون سے کچھ نہ کچھ فرق دکھائی دیتا ہے،

قالینون کی صنعت میں پولینڈ نے اگرچہ ایرانی قالینون کا معیار حاصل کرنے کی بہت کچھ کوشش کی، تاہم نقل مطابقِ اصل نہ ہوسکی، بہرحال پارچہ بافی کے ایک دوسرے شعبہ یعنی ریشمی منقش چادرون کے بُننے میں اُسے نسبتہً زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، یہ چادرین ایرانی نمونہ کے مطابق ریشم اور سونے چاندی کے تاروں سے بُنی جاتی تھیں، پہلے ان کے کارخانے پولینڈ کی جنوبی مشرقی سرحدوں پر قائم کئے گئے تھے، یہ چادرین اٹھارہوین

صدی میں پولینڈ کے امرا کے لباس کا ضروری جزو بن گئیں، پولینڈ میں ان کو رواج سب سے پہلے آرمینی تاجرون نے دیا، یہ لوگ ایران اور دوسرے اسلامی ممالک سے منقش چادریں کثیر تعداد میں لاکر فروخت کرتے تھے، پولینڈ میں ان چادرون کی مانگ اسقدر بڑھی کہ بہت جلد بعض اسلامی ممالک اور خصوصاً استنبول میں ان کے متعدد کارخانے قائم ہوگئے، جہان سے یہ چادرین بکثرت پولینڈ میں بھیجی جانے لگیں، اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں لواؤ کے تاجرون نے ایک بڑی تعداد ان چادرون کی باہر سے منگاکر تمام پولینڈ میں فروخت کی، لواؤ کے تجارتی رجسٹر سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ چادرین بغداد، اصفہان، انقرہ، اور حلب وغیرہ سے آئی تھین، ان چادرون کا استعمال اس کثرت سے ہونے لگا کہ استنبول کے بعض کارخانوں نے اپنی شاخیں پولینڈ میں بھی کھول دین، اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ان کے کارخانے ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہوگئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ان کارخانوں نے پولینڈ کی ضرورت کے لئے کافی چادریں تیار کرنا شروع کردین، اور مشرقی چادروں کی درآمد بہت کم ہوگئی، یہانتک کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک انکی آمد بالکل بند ہوگئی، تاہم اس کے بعد بھی پولینڈ کے کارخانون میں جو چادریں تیار کیجانے لگین، وہ تمامتر مشرقی ہی نمونون کے مطابق ہوتی تھیں، یہ پولش چادرین پولینڈ میں اسلامی آرٹ کے اثر کا آخری اور شاید سب سے زیادہ خوبصورت نمونہ ہین،

سترہوین اور اٹھارہویں صدی میں صرف زربفت، قالینون اور منقش چادروں ہی کی صنعتون میں اسلامی آرٹ کا اثر ظاہر نہیں ہوا، بلکہ اسلحے، گھوڑوں کے ساز اور وہ تمام چیزین جو لوہے کے سامان اور گھوڑوں کے ساز وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، اسلامی آرٹ کے نمونہ کے مطابق بنائی جانے لگین، ان صنعتوں میں لواؤ ہی سب سے پیش پیش رہا، اور اسی کے کارخانون نے ان چیزون کو تمام پولینڈ میں پھیلایا، سترہوین صدی کے آخر میں لواؤ میں اسلامی آرٹ کے نمونہ کے مطابق جو چیزین بنائی جاتی تھین، اُن میں سے چند یہ ہین، تلوارین، کمان، ترکش، ڈھال، زین، لگام، کارتوس کے بکس، پیٹیان، پرتلے، پستول کے خانے، باگ ڈور اور

تلواروں کے قبضے، لواؤ نے ان صنعتون کو ترقی دیکر پورے ملک میں پھیلا دیا، ان میں سے بعض چیزون پر طلاکاری اور میناکاری بھی ہوتی تھی، اور قیمتی نگینے بھی جڑے جاتے تھے،

لواؤ کی مذکورۂ بالا صنعتون کی ترقی کے دو دور تھے، پہلے دور میں تو اسلامی آرٹ کے نمونون کے مطابق چیزین تیار کی جاتی تھیں، کاریگر اگرچہ پولینڈ ہی میں رہتے تھے، لیکن وہ غیر نسل کے لوگ تھے، وہ لوگ مشرق سے آئے تھے، اور اُسوقت تک براہ راست اسلامی آرٹ کے زیر اثر تھے، وہ ایرانی یا ترکی مملکتون کے آرمینی یا یونانی باشندے تھے، جو نقل مکان کرکے پولینڈ میں آباد ہوگئے تھے، یہان پہنچ کر بہت جلد اُنھیں لائق شاگرد اور تبع مل گئے، ان شاگردوں نے جب بطور خود چیزین بنانی شروع کین، تو چونکہ وہ مغربی آرٹ کی صناعیون کے زیادہ عادی اور ماہر تھے، اس لئے جدید مصنوعات میں بھی مغربی ہی آرٹ کا اثر زیادہ نمایان رہا، یہ لواؤ کی صنعتون کی ترقی کا دوسرا دور تھا، تاہم اون مصنوعات میں بھی جن میں پولینڈ کے ملکی کاریگروں نے مغربی رنگ پیدا کردیا تھا، اسلامی آرٹ کی اثر اندازی صاف طور پر ظاہر تھی،

پولینڈ نے خیمون کی زینت اور آرائشگی کا طریقہ بھی مشرق ہی سے لیا، ۱۶۰۱ء میں شاہ زیگمنٹ ثالث (Zygmunt III) نے لواؤ کے ایک آرمینی باشندہ سیفر موراٹووکز (Sefer Muratowicz) نامی کو اس غرض سے ایران بھیجا، کہ وہان ایک مرصع خیمہ بنوائے، اور اوس کی تیاری کو بچشم خود دیکھے، سفر میں بادشاہ اور اوس کے درباری امرار وغیرہ مشرقی طرز کے مرصع خیمے استعمال کرتے تھے، اور یہ رواج اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک قائم رہا، لیکن خیمون میں صرف مرصع کاری ہی مشرقی طرز کی ہوتی تھی، ایسے خیمے بنتے پولینڈ ہی میں تھے، اور زیادہ تر لواؤ اور بردڈی کے یہودی کاریگر بناتے تھے،

پولینڈ میں اسلامی آرٹ کا اثر زیورات پر بھی پڑا، اور اس میں آرمینی باشندون کی وساطت زیادہ اہم ثابت ہوئی، ان لوگون نے پولینڈ کے جنوبی مشرقی شہرون اور خصوصاً لواؤ میں آباد ہوکر ملکی زیورات مین

اسلامی صناعیوں کے بعض اجزاء داخل کردئے، لیکن لواؤکی مذکورۂ بالا صنعتوں کے دوسرے دور کی طرح زیورات میں بھی مغربی اور اسلامی آرٹ کا اثر اکثر متحدہ طور پر نظر آتا ہے،

اسلامی آرٹ کا اثر پولینڈ کے تمام حصوں پر یکساں طور پر نہیں پڑا، جنوبی مشرقی سرحد پر جو اسلامی ممالک سے متصل تھی یہ اثر سب سے زیادہ نمایاں تھا، اور وہیں سے نکل کر پایۂ تخت وارسا اور ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گیا، مدت کے لحاظ سے اسلامی آرٹ کی اثر اندازی سترہویں اور اٹھارہویں دونوں صدیوں تک قائم رہی لیکن ۱۶۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک کا زمانہ اس کے کامل تسلط کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، جبکہ اپنی بیشتر مصنوعات میں پولینڈ تمامتر اسی آرٹ کا مقلد اور پیرو تھا،

"ع ز"

سیرت النبی جلد پنجم چھپ گئی

الحمد للہ سیرۃ النبی کے اہم سلسلہ کی پانچویں جلد چھپ گئی، اس جلد کا موضوع تعلیمات نبوی میں سے عبادات کی تشریح وتفصیل ہے، اس میں پہلے عبادت کی حقیقت اور اسلام میں عبادت کے انواع واقسام کا بیان ہے، پھر اسلام کے فرائض خمسہ، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ سیر حاصل بحثیں ہیں، پھر توکل، صبر، اخلاص، تقوی، اور شکر کے معانی ومطالب قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھائے گئے ہیں، امید ہے، شائقین اس کی خریداری میں عجلت فرمائیں گے، تاکہ رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں اس کا مطالعہ فرماسکیں،

تاجرین کتب کو چاہئے کہ جلد سے جلد مطلوبہ نسخے اپنے شہر کے شائقین کے لئے ریل کے ذریعہ سے منگوا کر دیہیا رکھیں، تاکہ محصول کی کفایت سے تاجر و خریدار دونوں کو فائدہ پہنچے،

تقطیع کلاں، ضخامت ۴۰۰، صفحے قیمت: قسم اعلیٰ عہ، قسم دوم للعہ

منیجر

اخبار علمیہ

برص وجذام کے استیصال میں زمانۂ حال کی کوشش،

برص وجذام تاریخ کی سب سے قدیم بیماریاں ہیں جن کی مدت تین ہزار سال بتائی جاتی ہے، انیسویں صدی کے نصف تک ان کے استیصال کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی، جو لوگ ان امراض کے شکار ہوتے تھے انھیں آبادی سے نکال کر کسی دور دراز مقام پر بھیج دیا جاتا تھا، اور ان کے علاج کے لئے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی جاتی تھی، ۱۸۴۸ء میں ناروے کے دو ڈاکٹروں ڈینیل ڈینیل سن (Daniel C. Danielssen) اور کارل بوئک (Karl W. Boeck) نے ان امراض کے متعلق پہلا جامع سائنٹفک رسالہ لکھا، پھر ۱۸۷۳ء میں آرمر ہانسن (Armur Hansen) نے جو ڈینیل سن کا داماد اور ناروے میں برص وجذام کے معالجہ میں اس کا جانشین تھا، وہ جرثومہ دریافت کیا جسے وہ برص وجذام کا جرثومہ سمجھتا تھا، اسی سال بلجیم کے مشہور مشنری فادر ڈامین (Father Damien) نے اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کرکے جزیرہ مولوکائی (Molokai) میں جاکر مستقل سکونت اختیار کرلی جہاں حکومت ہوائی (Hawaii) نے برص وجذام کے مریضوں کو جلاوطن کردیا تھا، اس نے ان مریضوں کے کھانے، پانی، اور مکانات میں بہت کچھ اصلاحیں کیں، اور برسوں کی جانفشانی سے بالآخر دنیا کی توجہ ان کی جانب مبذول کرادی، مجذوموں کے ساتھ ہر وقت رہنے سہنے سے وہ خود بھی اس مرض کا شکار ہو گیا، اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کرگیا، لیکن اس کا ایثار اور بے لوث خدمت اپنا اثر دکھا کر رہی، اور برص وجذام کے استیصال کا مسئلہ تمام دنیا کے لئے روز بروز جاذب توجہ ہوتا گیا،

فادر ڈامین کا کام اب ہر ملک میں جاری ہے، ۱۸۷۴ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص ولزلی بیلی (Wellesley C. Bailey) نے مجذوموں کے لئے ایک مشن (The Mission for the Lepers) قائم کیا، جو ساٹھ سال سے برابر برص وجذام کے علاج اور استیصال کی کوششوں میں مصروف ہے، اب اس مشن کی ایک شاخ امریکہ میں بھی کھل گئی ہے، حال میں ماہرین جرمیات (Bacteriologists) نے بھی ان امراض کی جانب توجہ کی ہے، اوران میں سے بہتیرے ان کی تحقیقات کے لئے مبروصون اور مجذومون کی نوآبادیوں میں جاکر سکونت پذیر ہوگئے ہیں چنانچہ اس جماعت کے ایک بہت مشہور امریکن ڈاکٹر ہربرٹ ڈبلیو ویڈ (Herbert W. Wade) نے ۱۹۲۲ء میں کیولیون (Culion) جاکر وہاں مستقل طور پر قیام اختیار کرلیا ہے، یہ مقام جزائر فلپائنس (Philippines) میں واقع ہے، جہاں برص جذام کے مریضوں کی ایک بڑی نوآبادی قائم ہوگئی ہے، ڈاکٹر ویڈ نے وہاں پہنچکر ان مریضوں کے لئے ایک عظیم الشان شفاخانہ قائم کیا ہے، جو دنیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا شفاخانہ ہے، وہاں نہ صرف برص وجذام کا علاج ہوتا ہے، بلکہ ان کے اسباب وعلل کی تحقیق بھی کی جاتی ہے، ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر موصوف کی اہلیہ اس شفاخانے کیلئے سرمایہ کی فراہمی کے مقصد سے امریکہ واپس آئی تھیں اور وہ اپنی جدوجہد میں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ امریکہ میں ایک زبردست ادارہ لیونرڈ ووڈ میموریل (LEONARD WOOD MEMORIAL) کے نام سے برص وجذام کے استیصال کے لئے قائم ہوگیا ہے، اس ادارہ کے پیش نظر یہ تجویز ہے، کہ تمام دنیا میں ان امراض کی تحقیق کے لئے مرکز قائم کردئے جائیں، کیونکہ باوجود انتہائی کوششوں کے ابھی ان کے اسباب متعین طور پر معلوم نہیں ہوسکے ہیں، اور یہ امراض ہر طرف کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں، تمام دنیا میں انکے مریضوں کی تعداد تقریباً تیس لاکھ ہے، جن میں سے صرف پچاس ہزار سے کم کا علاج مناسب اور معقول طریقہ پر ہو رہا ہے، کیولیون کا شفاخانہ اپنی خدمات میں سب سے زیادہ ممتاز ہے، گذشتہ دس سالوں میں ڈھائی ہزار سے زیادہ مریض وہاں سے تندرست ہوکر اپنے گھر واپس آچکے ہیں،

قصر ابونصر کے آثار قدیمہ

ایران کے جنوبی مغربی حصہ میں شیراز کے قریب دو سال سے کھدائی کا کام جاری ہے، اس مقام کو اب قصر ابونصر کہتے ہیں، پچھلے سال جو آثار قدیمہ وہاں برآمد ہوئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں ایک قلعہ ہے، اس قلعہ کی عمارت آرایش سے یکسر خالی ہے، لہذا اوس کی قدامت کا اندازہ صرف ان چیزون سے کیا جاسکتا ہے، جو وہاں پائی گئی ہیں، یا قرب وجوار کے قلعون سے مقابلہ کرکے کچھ قیاس کیا جاسکتا ہے، قلعہ کی چہاردیواری کے اندر جو مکانات ہیں، ان میں بھی کوئی نقش ونگار نہیں ہیں، اس کی زبردست دیوارین شاپور اور اصطخر کے آثار سے ملتی جلتی ہیں، قلعہ کی عمارتون میں جو سکے، مٹی کے برتن، اور مہرین پائی گئی ہین ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ قلعہ پورے ساسانی عہد نیز اس سے قبل اشکانی عہد میں بھی کچھ دنون آباد تھا، کھدائی میں علاوہ چند سکوں کے اور کوئی چیز عربی دور کی نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ قصر ابونصر کا عرب فتوحات کے بعد بالکل زوال ہوچکا تھا، اردشیر خرہ کے ساسانی صوبہ کی جس میں یہ مقام واقع ہے، ایک ایسی مہر ملی ہے، جس سے بارھوین صدی کے ایک محقق کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کہ یہ قلعہ عرب فتوحات سے پہلے کا شیراز تھا، جو عربوں کی آمد کے بعد چار میل مغرب کی جانب منتقل کردیا گیا،

منجملہ دیگر آثار قدیمہ کے ساسانی عہد کے بڑے بڑے اتنی مٹکے بھی پائے گئے ہیں، جو دو فٹ سے پانچ فٹ تک اونچے ہیں، ان کی شکلیں مختلف قسم کی ہیں، اور ان میں سے کسی دو پر بھی یکساں نقش ونگار نہیں ہیں، مٹی کے چھوٹے برتن بہت کم سالم حالت میں ملے ہیں، دو دستون کا بھی ایک خاص قسم کا مٹکا ملا ہے، جس کی گردن لمبی ہے، یہ عراق کے ساسانی اور اشکانی عہد کے مٹکوں سے بہت مشابہ ہے، بہت سی ساسانی مہرین، اور مہرون کے نقوش بھی پائے گئے ہیں، جن میں سے بعض پر ساسانی حکومت کے عہدہ دارون کی تصویرین بنی ہوئی ہین دھات کی بھی مختلف چیزین برآمد ہوئی ہیں، ان میں کانسہ کا ایک شمعدان ہے، جو ساسانی عہد کا خیال کیا جاتا ہے

چند طلائی زیورات ہیں، جو ساتویں صدی عیسوی کے معلوم ہوتے ہیں، کانسہ کے کانٹے اور چمچے بھی ایک بڑی تعداد میں پائے گئے ہیں، کانسہ کی ایک نقاب بھی ملی ہے، جس سے ایران میں یونانی روایات کی ترویج کا اندازہ ہوتا ہے، اور ایک سر بھی کسی جانور کا کانسہ کا بنا ہوا ملا ہے، جو بالکل ایرانی ہے، شیشہ کی چیزوں میں چند بوتلیں ہیں، ایک جوڑ گڑیا ہے، آنکھ میں دوا ٹپکانے کا ایک آلہ ہے، اور اسی قسم کی چند اور چیزیں ہیں، بلور کا نہایت نفیس بنا ہوا ایک سر بھی برآمد ہوا ہے، جس کے بالوں، آنکھوں اور لبوں میں ابھی تک رنگ کا اثر باقی ہے،

مصنوعی ریڈیم

امریکہ کے ایک سائنسدان پروفیسر ارنسٹ لارنس (Ernest Lawrence) نے نمک سے مصنوعی ریڈیم بنانے کا ایک طریقہ دریافت کیا ہے، اگر یہ طریقہ کامیاب ثابت ہوا، تو آکلہ اور سرطان کے علاج میں اس مصنوعی ریڈیم سے بے حد مدد ملے گی، اصلی ریڈیم نہایت قیمتی ہونے کی وجہ سے ہر مریض کو میسر نہیں آسکتا، اس وقت اس کی قیمت فی گرام دس ہزار پونڈ ہے، مصنوعی ریڈیم نہایت ارزاں ہونے کے علاوہ ڈاکٹروں کے خیال میں آکلہ کے لئے زیادہ مفید بھی ہوگا، کیونکہ اب تک اصلی ریڈیم کا علاج صرف خارجی طور پر کیا جاسکتا ہے، اور یہ مصنوعی ریڈیم زخم کے اندر بھی داخل کیا جاسکے گا،

سنہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان اور ویلز میں پیدائش و موت کی رفتار

سنہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان اور ویلز میں (۵۹۰،۶۴۲) بچے زندہ پیدا ہوئے، یعنی ایک ہزار کی آبادی میں (۱۴،۸) یہ اوسط سنہ ۱۹۳۳ء کے اوسط سے (۴ر) زیادہ تھا، سنہ ۱۹۳۳ء کا اوسط ہر سال سے کم تھا، سنہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان اور ویلز میں موت کا اوسط فی ہزار (۱۱،۸) تھا، جو سنہ ۱۹۳۳ء کے اوسط سے (۰،۵) کم تھا، ان ممالک میں لوگوں کی اوسط عمر روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہے،

"ع ز"

باب التقریظ والانتقاد

شاہان گوجر

مؤلفہ مولوی ابوالبرکات محمد عبدالمالک خانصاحب سابق مشیر بھاول پور، رئیس کھوری ضلع گجرات پنجاب، ۵۴۰ صفحے قیمت تین روپے،

ازمولینا سید ابوظفر صاحب ندوی

گوجر راجپوت اور جاٹ کے متعلق ہمیشہ ہندوستان کے مورخین تحققات میں مصروف رہے، اور اپنے نتائج وافکار سے لوگوں کو مستفیض کرتے رہے، "شاہان گوجر" کے مصنف نے ان معلومات کو اپنے خاص دلائل اور نظریوں کے ساتھ بہت خوبی کیساتھ یکجا کر دیا ہے،

کتاب ۵۴۰ صفحوں میں ہے، اور ۱۶ ابوابوں پر بٹی ہوئی ہے، شروع میں ایک دیباچہ اور مقدمہ بھی ہے، دیباچہ میں "اتحاد قومی" کے ارکان خمسہ میں سے نسبی، مذہبی، اور وطنی اتحادوں کی تشریح ہے، اس کے بعد تاریخ کی تعریف، تاریخ کا موضوع، مورخین کے طبقوں وغیرہ کا ذکر ہے، پھر مبادیات تاریخ ہے، جس کے نیچے چھ مقالے ہیں،

پہلے مقالہ میں ہندوستان کے باہر سے آنے والی قوموں کی تقسیم ہے، دوسرے میں ہندوستان کے اصل باشندوں اور آرین قوم کا تذکرہ ہے، تیسرے میں آرین قوم کے قبائل اور ہندوستان میں آباد ہونے کا بیان ہے، چوتھے میں آرین قوم کی تنظیم، تمدن، اور خلط نسب کے حالات ہیں،

پانچویں میں آریون کی مذہبی کتابوں کا ذکر ہے، چھٹے میں ہندوؤں کے چاروں ورنوں کو بتایا ہے،

صفحہ ۳۰ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے، پہلے باب میں برہمنوں کے اقوال کے مطابق دنیا کی پیدایش، آریوں کے مختلف ذاتون میں منقسم ہونے، اور پھران ذاتون کے مختلف شاخوں مین پھیلنے، کھتریون اور راجپوتون کے باہم خلط نسب کو تفصیل سے بیان کرکے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، جو میرے خیال مین تقریبًا بالکل صحیح ہے،

دوسرے باب میں سولہ فصلیں ہیں فصل اول میں لفظ "گوجر" کی تحقیق ہے، اوران افواہون کی تردید ہے، جواس کے متعلق لوگوں میں مشہور ہیں، اوراس مستند قول کی تائید کی ہے، کہ گرجستان سے آنے والی قوم کا نام گوجر ہے،

فصل دوم میں اس بات کو ثابت کیا ہے، کہ لفظ اکثر اوقات، ملک، آب وہوا، اور قوم کے تبدل وتغیر سے بدل جاتا ہے، اسلئے گوجر، گجر، گرجارا، گرجرا، یہ سب ایک ہی ہم معنی لفظ ہین،

فصل سوم میں جس کو فصل سابق کا تتمہ سمجھنا چاہئے، ایک دلچسپ انکشاف کا اظہار کیا ہے، کہ لفظ گوجر دنیا کی مختلف زبانون (یا ملکون) میں کن کن شکلوں میں بولا جاتا ہے، مثلاً ہندوستان میں گوجر، انگریزی میں گرجرا، چین میں کوسا، روس میں خوالیس، روم میں چوزار، آرمینیا میں خزر، عرب میں جزر، بحیرۂ آزاف میں گزر، شام میں غیسر، کاکیشیا میں غاسر (گاسر) ایران میں قاچار،

فصل چہارم میں گوجروں کے ابتدائی وطن کو متعین کیا ہے، کہ وہ وسط ایشیا ہے، سنہ ۳۰ ق م مین یہان سے نکل کر سیحون کے علاقہ پر قابض ہوگئے، اس قوم کا اصلی نام "یوچی" ہے، جو ترکون کا ایک قبیلہ ہے، اور یورپین اون کو سیتھین کہتے ہین، یہ پہلی صدی میں وہان سے ہجرت کرکے کشمیر، کابل، اور پنجاب مین پہونچ گئے،

فصل پنجم میں راماین اور مہابھارت کے اقتباسات سے ثابت کیا گیا ہے، کہ گوجر اس عہد میں بھی

موجود تھے، اور فصل سابق سے تطبیق اس طرح دی گئی ہے، کہ گویہ قوم آرین عہد سے ہندوستان میں مختلف اوقات میں آتی رہی، مگر پہلی صدی سے فاتحانہ یہان داخل ہوئی، اور چوتھی صدی میں انکا عروج ہوا،

گوجرون کے مذہب کے متعلق لکھا ہے، کہ یہ سورج پرست تھے، اوراسی سبب سے ان کو مہر بھی کہتے ہین، اس بیان سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے، کہ کاٹھیاواڑ میں ولبھی خاندان سے کچھ پہلے جو قوم مہر کے نام سے قابض تھی، وہ درحقیقت انہی گوجروں کی ایک گوت تھی، اور سورج کی پوجا کرتی تھی،

مؤلف نے لکھا ہے، کہ یہ قوم سورج پرستی کے لئے اس قدر دیوانی تھی، کہ ہر موقعہ پر سورج دیوتا کو یاد کرتی، اور بات بات پراس کا تذکرہ کرتی، مثلاً جب گھرسے نکلا تو سورج مہاراج کی سواری نکل رہی تھی، (صبح کا وقت تھا) اور جب وہان سے آرہا تھا، تو سورج مہاراج کی سواری جاچکی تھی (رات ہوگئی تھی)، ......

بعض لوگ سورج کی شکل کے سونے چاندی کے حمائل گردن مین ڈالتے، عورتون کے آنچل یا گھونگٹ پر سورج مکھی کی تصویر ہوتی، گجرات اور کاٹھیاواڑ میں سلاطین گجرات کی جس قدر عمارتین میری نظر سے گذرین، خصوصاً مساجد اور مقابر پر، عموماً سورج مکھی کی تصویریں ہیں، مؤلف کے بیان سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے، کہ یہ اسی مہر پرستی کا اثر ہے، جو عہد اسلام تک باقی رہا، اور چونکہ غیر ذی روح کی تصویر تھی، کوئی مانع نہیں ہوا، ان کے انجنیر راج، مزدور عموماً غیر مسلم ہوتے تھے، اسلئے بہت ممکن ہے کہ یہ سب "مہر گوجر" ہون،

گوجر جب ہندوستان میں مقیم ہوگئے، تو ہندوؤں کے اثر سے ۲۴ قسم کے دیوتاؤں کو ماننے لگے، جسکا ذکر بہ تفصیل مؤلف نے اپنی کتاب میں کیا ہے،

صفحہ ۳، میں درج ہے، کہ "کرشن ہندوستان میں دو ہوئے ہین، ایک دوسری صدی عیسوی میں بمقام دوارکا، اور دوسرا متھرا میں، گوجر قوم کا ایک شخص کرشن نامی سنہ ۶۰۰ء مین ہوا،"

لیکن ہندوستان کی عام تاریخیں اسکی مؤید نہیں ہیں، کیونکہ دوارکا والا کرشن بھی درحقیقت متھرا ہی کا باشندہ تھا، جو مہاراجہ جراسندھ (ممالک متوسط) کے حملوں کی تاب نہ لاکر دوارکا چلا گیا، اور پھر مہابھارت کی کامیاب جنگ لڑکر واپس ہوا، مہابھارت کی جنگ بودھ سے پانچسو برس پہلے گذری ہے، ایسی صورت میں دوارکا میں کرشن کی موجودگی سنہ ۲۰۰ صدی عیسوی میں کیونکر ہو سکتی ہے، یقیناً ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کے نامہ نگار کو اس معاملہ میں مغالطہ ہوا ہے،

گوجروں کی زبان کے متعلق صفحہ ۸۰ میں بحث کی ہے، ص ۸۰ پر جو نمونہ دیا ہے، وہ اس زبان سے بہت مشابہ ہے، جو کاٹھیاواڑ و گجرات میں مستعمل ہے، اور اس سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، کہ یہ دونوں یا تو ایک ہی نسل سے ہیں، یا عرصۂ دراز تک دونوں ایک ساتھ رہے ہیں،

اس کے بعد گوجروں کے اخلاق، رسوم و رواج، سپہ گری، زراعت، تجارت پر مفصل بیان ہے، گوجروں کی آبادی کہاں کہاں ہے، ص ۱۱۰ پر تشریح سے اسکو لکھا ہے، گو یہ صحیح ہے کہ کاٹھیاواڑ گجرات میں گوجروں نے اپنی ذات تبدیل کرلی ہے، پھر بھی مختلف شکلوں میں اسوقت بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں، پیشوں کے علاوہ مختلف اقوام گوجر اپنی گوت کے نام سے مشہور ہیں، مثلاً مؤلف نے کسی جگہ لکھا ہے، کہ گوجر کی ایک گوت گورسی بھی ہے، اور گورسی گرس، گراسیہ، سب ایک ہی ہم معنی لفظ ہیں، جو مختلف ممالک کے تلفظ سے متغیر ہوکر جدا جدا نظر آتے ہیں،

کاٹھیاواڑ و گجرات میں "گراسیہ" بڑی تعداد میں آباد ہیں، جو اپنے کو گوجر نہیں بلکہ گراسیہ کہتے ہیں، اور چونکہ یہ عموماً کاشتکار اور زمیندار ہیں، اسلئے عام طور پر لوگ آج کل گراسیہ کے معنی کاشتکار اور زمیندار کے لیتے ہیں، جس طرح "خان" کا لفظ جو سردار کے لئے وضع کیا گیا تھا، اس سے مراد اب پٹھان ہوتا ہے،

مؤلف نے باب سوم بڑی کاوش اور محنت سے تحریر کیا ہے، اور مدلل طریقہ سے اس بات کو ثابت کیا ہے، کہ گوجر، راجپوت، جاٹ درحقیقت ایک ہی شجر کی متعدد شاخیں ہیں، اور بڑی تفصیل اور تشریح سے اسکو بیان کیا ہے، کہ آج کل راجپوتوں کے مشہور قبیلے مثلاً چوہان، پرمار وغیرہ درحقیقت یہ سب راجپوت گوجر ہیں، اور یہ دعوی بھی بالکل صحیح ہے، کہ راجپوت ایک مخلوط النسل قوم کا نام ہے، جس میں ہر اس نسل و قوم کا آدمی شامل ہے، جس کے بزرگوں نے کبھی تخت و تاج پر قبضہ کرلیا تھا،

صفحہ ۱۹۱ میں محمود غزنوی کے متعلق ٹاڈ صاحب کی راجستان سے یہ فقرہ نقل کیا ہے، کہ سندھ میں جاٹوں نے محمود غزنوی کو شکست فاش دی، افسوس ہے کہ ابھی تک کسی تاریخ میں میری نظر سے یہ فقرہ نہیں گذرا، بلکہ یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ محمود ہی وہ شخص ہے کہ جس نے عمر بھر کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا، بات یہ ہے کہ ٹاڈ صاحب کو اپنے ممدوحین (راجپوت) کا اسقدر خیال رہتا ہے کہ جہاں کہیں بھی سوئی کے ناکہ برابر رخنہ نظر آئے، وہ اس سے دریا بہانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اصل واقعہ صرف اس قدر ہے کہ سومناتھ سے واپسی کے وقت جب محمود ملتان جا رہا تھا، تو راستہ میں سندھی جاٹوں نے چوری اور ڈاکہ زنی شروع کی، اور چونکہ اس کی فوج ریگستان سے تھکی ہوئی آرہی تھی، اور مال غنیمت سے لدی تھی، اس لئے سلطان نے ان کی شوخی سے چشم پوشی کی، لیکن دوسرے ہی سال ان کی پوری پوری گوشمالی کردی گئی،

ص ۲۰۲ میں "جھالا" اور گوہل کو گوجروں کا ایک گوت تحریر کیا ہے، مؤلف کے اس بیان سے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ کاٹھیاواڑ کے ایک ضلع کا جو جھالاواڑ، اور گوہیل واڑ نام ہے، وہ انہی گوجروں کا آباد کردہ ہے، جنکی نسبت یہ مشہور ہے، کہ وہ پنجاب یا راجپوتانہ سے قبل اسلام آئے،

چاوڑا خاندان کے ابتدائی حالات جو ص ۲۳۲ پر آئین اکبری سے نقل کئے گئے ہیں، وہ کسی طرح سے صحیح نہیں، علامہ ابو الفضل نے یہ تمام حالات ہندوستان کے برہمنوں سے حاصل کئے ہیں، اور مرآۃ احمدی

نے بھی یہ حالات آئین اکبری سے لئے ہیں، لیکن مرآۃ احمدی نے بن راج بکسر بانہیں، بلکہ بن راج بفتح با تحریر کیا ہے، جس کے معنی جنگل کا راجہ ہے، جو بالکل صحیح ہے، کیونکہ یہی اس کا لقب تھا

ص ۲۴۰ میں بھیم راج کے متعلق جو سنہ درج ہے، افسوس ہے کہ اسکی تصحیح بھی غلط نامہ میں درست نہیں ہے، بھیم راج یا کھیم راج کی صحیح تاریخ ۸۴۲ء تا ۸۶۶ء ہے،

راجہ بیر سنگھ کے متعلق جو آئین اکبری اور دیگر کتب کے ناموں میں تطبیق دی گئی ہے وہ فارسی املا تک تو صحیح مانی جاسکتی ہے، مگر جہاں یہ نام ہندی اور گجراتی حرفوں میں ہوں، وہاں یہ تشابہ ناممکن ہے، اسلئے اس قسم کے حالات کے تحت ایسے معاملہ میں آئین اکبری پر مرآۃ محمدی کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ صاحب البیت ادری بمافیہ کے علاوہ اوس کا مولف گجراتی زبان سے بخوبی واقف تھا، اور جدید تحقیقات سے بھی اوس نے اپنی کتاب میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، محض حسن ظن کسی مورخ کے بیان کردہ واقعات کا معیار صحت نہیں ہوسکتا،

مؤلف نے صفحہ ۲۴۳ پر سولنگی گوجروں کے متعلق وجہ تسمیہ (شیولنگی) بیان کیا ہے، وہ بہت ہی قرین قیاس ہے، بشرطیکہ یہ ثابت ہوجائے، کہ اس خاندان کے اکثر ارکان لنگ کے پجاری تھے،

سدھ راج گجرات کا بڑا طاقتور اور مدبر راجہ گذرا ہے، یہ اس کا لقب تھا، اور اسی نام سے وہ زیادہ مشہور ہے، جے سنگھ اس کا اصلی نام ہے، اور اس کی تائید اس کے ہمعصر مسلمان (شیعہ بوہرے) مورخوں کی کتابوں سے ہوتی ہے،

صفحہ ۲۶۶ پر آئین اکبری سے بھیم دیو باگھیلہ کی مدت ۶۴ سال تحریر کی ہے، لیکن کیا عجیب بات ہے، کہ اس ۶۴ سالہ حکومت کی تائید نہ تو سکوں سے ہوتی ہے، نہ نامہ پترسے، (جو گجرات میں بکثرت دریافت ہوئے ہیں،) اور نہ گجراتی تاریخیں اوس کی مؤید ہیں، اور نہ ترتیب سنین سے، اس کے لئے کوئی جگہ نکلتی ہے، ایسی حالت میں محض خوش اعتقادی سے کسی واقعہ کی صحت کیونکر تسلیم کیجاسکتی ہے،

صفحہ ۲۷۶ پر ٹاڈ کے حوالہ سے یہ لکھا گیا ہے، کہ لنگاہ، اور توگیرا دونوں سولنگی گوجر ہیں، خاندان لنگاہ ضلع ملتان میں اب بھی آباد ہے، عہد اسلامی میں یہ مشہور خاندان گذرا ہے، ۸۴۷ھ سے ۹۳۱ھ تک ۸۴ برس اس نے ملتان پر حکومت کی، عہد ہمایونی میں اس کا خاتمہ ہوا، مگر تعجب ہے کہ مؤلف نے ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا،

صفحہ ۳۰۹ میں بلہارا (بلہرا) راجہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ تقریباً صحیح ہیں، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ولبھی پور، اور ولبھ رائے دو علحدہ علحدہ سلطنتیں تھیں،

ولبھی پور کاٹھیاواڑ میں ہے، اور اس کا بانی بھٹ ٹارک گوجر ہے، جس کو بھٹارک بھی کہتے ہیں، اسکی حکومت تقریباً ۵۰۹ء سے ۵۲۰ء تک ہے، اور اسی عہد میں ولبھی پور آباد ہوا، ولبھ کے معنی محمود کے ہیں، غالباً نیک شگون کے خیال سے ولبھی پور (محمود پور) اسکا نام رکھا گیا، انکے آخری راجوں کا لقب شلادت تھا، مگر عام طور پر لوگ ان کو ولبھی راجے کہتے ہیں،

ولبھ رائے جن کو عرب سیاحوں نے بلہرا لکھا ہے، دکنی راشٹ کوٹ خاندان کے حکمران ہیں، ان کا پایہ تخت "مان کھیت" (مان کھیڑا) تھا، جس کو عرب سیاحوں نے "مانگیر" (مانگر) لکھا ہے، یہ مقام آج بھی سلطنت نظام کے ماتحت ایک چھوٹے گاؤں کی شکل میں موجود ہے، اس خاندان کا مشہور راجہ اموگھ ورش ولبھ رائے ہے، اسی کے عہد میں سلیمان بصری اور ابوزید سیرافی یہاں آئے ہیں،

ص ۳۱۱ پر ایک مقام کا نام "بھنمال" لکھا ہے، جو ممکن ہے، کہ صحیح ہو، عربی تاریخوں میں اسکو بیلمان کہا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ لفظ "بھیل مان" ہے، جو کسی زمانہ میں شمالی گجرات کے بھیلوں کا پایہ تخت تھا، اور بعد میں گوجروں کی راجدھانی ہوئی، جنوبی گجرات میں بھیلوں کی ایک دوسری سلطنت تھی جس کا پایہ تخت "اساول" (آسا بھیل) تھا، یہ اساول دریائے سابرمتی کے کنارے بڑا مشہور تجارتی شہر تھا، کرناوتی

کی آبادی سے یہ زوال پذیر ہوا، اور احمد آباد کی وسعت نے اسکو اپنے دامنوں میں لے لیا،

ص ۲۱۷ میں قنوج کے پال خاندان کا تذکرہ ہے، ۹۹۰ء تک اس خاندان کا راجہ وجیا پال حکمران رہا، پھر ص ۲۱۹ میں اس کے لڑکے راجپال (یا راج پال) کا ذکر ہے، اور ان دونوں کے درمیان راجہ جے پال اور انند پال راجہ لاہور کا تذکرہ کچھ اس طرح سے تحریر ہوا ہے کہ اس کا ربط اپنے ماقبل سے نظر نہیں آتا ہے، ممکن ہے کہ صرف پال کی مشابہت سے اس کا تذکرہ یہاں ہوا،

ص ۲۲۴ میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کا چچازاد بھائی سلطان محمد بن فیروز شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا، شاید مؤلف کو اس معاملہ میں مغالطہ ہوا ہے، سلطان محمد بن فیروز شاہ چچازاد بھائی نہیں ہے، بلکہ سلطان غیاث الدین تغلق کے بھائی رجب کے لڑکے کا لڑکا ہے،

سلطنت گجرات کے بانی کا اصلی نام مظفر خان ہے، جب وہ گجرات کا ناظم بنایا گیا، تو اسکو ظفر خان کا خطاب ملا، اور خودمختاری حاصل کر لینے کے بعد اس نے اپنا لقب مظفر شاہ رکھا،

احمد شاہ گجراتی کے نسبت بہادر شاہی سے آئین اکبری نے نقل کیا ہے کہ اس نے اپنے دادا کو زہر دیدیا، لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں، تاریخ الفی جو آئین اکبری کے مصنف کا ہمعصر ہے، اور فرشتہ جو مراۃ سکندری کا ہم عہد ہے، یہ دونوں اسکی تردید کرتے ہین،

ریاست ایڈر کی تاریخ میں سلطان احمد کے پہلے ہم عصر راجہ کا نام "پونجا" لکھا ہے، اسلئے اسکو صحیح سمجھنا چاہیئے،

ص ۲۴۰ پر ہے کہ راجہ منڈلیک نے سورت کے ایک اور قلعہ میں پناہ لی، یہ واقعہ فرشتہ نے ۸۷۶ھ کے تحت لکھا ہو حالانکہ اوس وقت سورت کا وجود بھی نہ تھا، سورت کی آبادی تو ۱۵۱۰ء کی ہے، در حقیقت اس کے بجائے "سورٹھ" ہونا چاہیئے، اور یہی غلطی ص ۲۵۱ کے علاوہ اور دوسرے متعدد مقامات پر ہے،

ص ۲۴۱ پر سرکھیج میں بنائے مسجد کی نسبت سلطان محمد شاہ بن سلطان احمد شاہ کے ساتھ کی ہے، اور مراۃ احمدی میں بھی ایسا ہی لکھا ہے، لیکن حضرت شیخ احمد گنج بخش کے روزنامچہ میں بہ تفصیل تحریر ہے، کہ مسجد اور تالاب حضرت نے خود تیار کرایا، باقی مزار، خانقاہ، اور مدرسہ کی بنیاد محمد شاہ نے رکھی،

سلطان قطب الدین کا نام "جلال خان" نہ تھا، ظفر الوالہ، اور طبقات اکبری میں اسکی تشریح ہی، کہ اصلی نام احمد خان ہو لیکن قطب الدین کے نام سے زیادہ مشہور ہے، ایک قلمی تاریخ میں یہ بات نظر سے گذری کہ جلال خان بن محمد شاہ قطب الدین کا بھائی تھا،

سلطان قطب الدین کے حالات میں درج ہے، کہ سلطان محمود خلجی نے قلعہ پر چڑھ کر قطب الدین کا تاج اور کمر بند اٹھا لیا، حالانکہ یہ جنگ میدان میں ہوئی تھی، اصل یہ ہے کہ محمود خلجی سلطان مالوہ نے خیمہ میں داخل ہو کر کرسی پر سے اٹھایا تھا،

ص ۲۴۴ پر "بیگڑہ" کی جو توجیہ کی گئی ہے، وہ قیاس مع الفارق ہے، دراصل یہ گجراتی لفظ "بیگڑو" ہے، جو اس بیل کو کہتے ہین، جن کے دونوں سینگ ہم آغوش ہونے والے انسان کی طرح نکلے ہوں، اس کے مقابل کا لفظ بھیلو ہے، جو برعکس معنی رکھتا ہے، چونکہ سلطان محمود گجراتی کی مونچھیں ایسی ہی تھیں، جس کی تائید ایک پرتگالی سیاح کے سفرنامے سے ہوتی ہے، جس نے لکھا ہے کہ سلطان کی مونچھیں اتنی بڑی ہیں، کہ کانوں میں لپیٹ لیتا ہے، اسلئے عوام نے اسکو بیگڑو (بواو مجہول) کہنا شروع کیا، جیسا ہندوستان کے جاہل عوام کنگ اڈورڈ کو اسکے سکہ مین تاج نہ ہونے کے باعث منڈلا بادشاہ کہتے ہین، اور چونکہ حرف (ڑ) کو گجراتی (ڈ) بھی تلفظ کرتے ہیں، اسلئے بیگڈو، اور پھر بیگڈہ ہوگیا، اور بہت آدمی بیگڑا، (بیگڑہ) بھی تلفظ کرتے ہین،

ص ۲۴۷ میں مہدی آخرالزمان کا ذکر ہے، ان کا صحیح نام "سید محمد" ہے،

ص ۲۵۲ پر سلطان بہادر شاہ گجراتی کے متعلق یہ ذکر ہے، کہ وہ دہلی سے جونپور چلا گیا، لیکن

گجرات کی کسی معتبر تاریخ میں اس کا ذکر نہیں ہے، البتہ امراے جونپور کی استدعا پر دہلی سے باغ پت تک آیا تھا کہ اسکو اپنے والد سلطان مظفر شاہ حلیم کے مرنے کی خبر ملی، اور وہ گجرات واپس چلا گیا،

سلطان بہادر شاہ گجراتی کی موت کے متعلق صحیح تر روایت یہی ہے، کہ وہ لڑتے ہوئے پانی میں ڈوب گیا، اور اوس کی تائید ایک پرتگیز سیاح کے سفرنامہ سے ہوتی ہے، جس نے اسکے غرق ہونیکی ایک تصویر بھی شائع کی ہے،[1]

ص ۵۰۳ پر بھی سورٹھ (کاٹھیاواڑ) کے بجاے سورت لکھا گیا ہے، جو صحیح نہین، بہادر شاہ کھنبائت سے سورٹھ گیا تھا، اور سورٹھ سے "دیو" جو اس سے متصل واقع ہے،

گجرات کے آخری بادشاہ سلطان مظفر کی نسبت لکھا گیا ہے، کہ "بھیس بدل کر بصورت گدا آوارہ شہر و دیار رہا،" جو کسی طرح صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ ہمیشہ راجہ جام اور کچھ کی پناہ مین مہمانون کی طرح آخر تک مع اہل وعیال زندگی بسر کرتا رہا، یہان تک کہ کچھ کے راجہ نے غداری سے اپنے مہمان کو خانِ اعظم کے حوالہ کردیا، اسوقت مظفر نے خودکشی کرلی،

انسانی متحجر ہڈیوں کی جو روایت اور مشاہدہ مؤلف نے تحریر کیا ہے، اسکی تائید تاریخ سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں نہر کھودنے کے وقت اسی قسم کی متحجر ہڈیان اور ڈھچر برآمد ہوئے تھے، جیسا کہ فرشتہ اور طبقاتِ اکبری وغیرہ مین مذکور ہے،

محمد بن قاسم فاتح سندھ کی آمد ۹۲ھ ہجری مین ہوئی ہے، یہ تاریخ تمام عربی تاریخوں میں موجود ہے، شاید کاتب نے غلطی سے ۵۲ھ لکھدیا ہے،

ص ۵۰۶ میں انہلواڑا کا دوسرا نام پٹنہ تحریر ہوا ہے، جو صحیح نہیں ہے، پٹنہ کی جگہ پٹن ہونا چاہیے، پٹنہ تو صوبہ بہار کا پایہ تخت ہے،

[1] آج سے چندسال پہلے یہ کتاب بڑودہ لائبریری میں نظر سے گذری،

ص ۵۱۶ پر جو تصحیح لفظ "ٹنگ" اور "طافن" کی کی ہے، جس سے مراد گوجر کی ایک قوم "ٹانک" ہے، جو پنجاب پر حکمران تھی، بہت ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن عربوں کی بیان کردہ ریاست "رہمی" سے برہما مراد ہونا بہت ہی مشتبہ ہے،

اول تو رہمی، پیگو، ٹانگو، سگائین، آوہ، امراپورہ، مانڈلہ، کے مختلف خاندانون میں سے کسی نے بھی یہ لقب اختیار نہیں کیا، عہدِ اسلام میں دو زبردست خاندان وہان حکمران رہے ہیں، اول تلائین، دوسرا "اون پھیا" ان میں سے کسی کو بھی رہمی نہیں کہا گیا، غیر ملکیوں نے ان کو شاہ پیگو یا شاہ مانڈلہ کہا ہے، برہما اور شاہ برہما کا لفظ نیا ہے، جو زیادہ تر شاہ (راجہ) منڈومن سے راجہ تھیبا تک استعمال ہوا ہے،

دوم ہاتھیون کی کثرت بھی ملک برہما ہونے پر دلالت نہیں کرتی، کیونکہ اس عہد میں آسام اور بنگال بھی ہاتھی کے مخزن تھے، چنانچہ عوام میں وہان کے پست قد کمنی ہاتھی کی کثرت کی نسبت آج تک مشہور ہے، کہ ہر گھر میں بچوں کے جھولوں کو جھلاتا رہتا ہے،

اسکے علاوہ سیاحت نامون میں واقعات مختلف قسم کے درج ہوتے ہین بعض مشاہدات بعض مستند ذریعہ سے سنی ہوئی باتین، اور کچھ افواہیں ہوتی ہیں، جن میں اکثر مبالغہ کا پہلو ہوتا ہے، ابنِ ندیم نے راشٹ کوٹون (ولب راے) کے پایہ تخت مان گھیڑ (مانگر) کے حال میں لکھا ہے کہ

"وہان ہاتھیوں کی بڑی کثرت ہے، صرف دھوبیوں کے پاس ایک لاکھ بیس ہاتھی ہیں،"[1]

سلیمان بصری لکھتا ہے کہ ولھب راے راشٹ کوٹوں کی سلطنت سمندر سے لیکر براہِ خشکی چین تک چلی گئی ہے حالانکہ یہ بالکل خلافِ واقعہ ہے، کیونکہ اسکے تین طرف سمندر اور شمال مشرق کی طرف گوجر، رہمی اور کامروپ کا راجہ حائل تھا،

اسی لئے مورخوں نے اس قسم کے بیان کو یا تو حذف کردیا ہے، یا مبالغہ کی طرف اشارہ کردیا ہے، چنانچہ مسعودی نے اس رہمی بادشاہ کے ذکر کے بعد یہ لکھدیا ہے، کہ لوگ اس کا حال مبالغہ سے بیان کرتے ہین[2]

[1] الفہرست ص ۴۹۵، [2] مسعودی جلد اول، ص ۴۰۴ جلد اول،

اب اس ملک کے حدود اربعہ پر غور کیجئے، عرب سیاحوں کے بیان کے مطابق ایک طرف اسکے سمندر ہے، اور ہم اسکو خلیج بنگال فرض کرتے ہیں، جو جنوب کی طرف ہے، دوسری طرف اسکی سرحد ولھب رائے راشٹر کوٹ سے ملی ہے، جو جنوب مغرب میں فرض کیجا سکتی ہے، اور یہ اڑیسہ کے متصل ہو گی، اس سلطنت کی ایک سرحد قنوج کے گوجر راجوں سے متصل ہے، جسکو شمال مغرب میں کہہ سکتے ہیں، اور یہ مغربی بنگال کا ملک ہوگا، اور بقول مسعودی اس کی ایک حد کامروپ سے متصل ہے، جو شمال میں واقع ہے، مشرق میں ایک طرف چین اور دوسری طرف برہما کی سرحدی ریاستیں ہیں، جو برمی جنرل تالابان کے حملہ سے قبل کبھی کسی کی پورے طور پر مطیع نہیں ہوئیں،

اس حدود اربعہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مشرقی بنگال کی ایک سلطنت تھی، جو راشٹر کوٹوں کے عہد میں کافی مضبوط تھی، عہد اسلام میں بھی بنگال کے دو حصوں پر دو حکمراں عرصہ تک سلطنت کرتے رہے، جن میں سے ایک کا لکھنوتی یا گورا اور دوسرے کا سنار گاؤں یا اکدالہ پایۂ تخت رہا ہے، پھر سلیمان بصری کہتا ہے کہ یہاں کے باریک کپڑے ایسے ہوتے ہیں کہ حلقۂ انگشتری سے نکل جاتے ہیں، اور بنگال (ڈھاکہ) ہی باریک ململ ابتدائے عہد انگلشیہ تک بنتا تھا، جس کی شہرت آجتک ہے، اسکے علاوہ کوڑیوں کا سکہ بھی جہاں تک مجھے معلوم ہے، سوائے بنگال کے کہیں رائج نہیں ہوا، اور یہ سکہ حال تک موجود تھا، کچھ عرصہ سے موقوف ہوگیا، بخلاف برہما کے سونے چاندی کے علاوہ کسی دھات کو آنکھ نہیں لگاتے، اور آج بھی خالص برہمی عورت سونے کے علاوہ چاندی تک کے زیور کو عیب جانتی ہے، پھر کوڑی کو کون پوچھتا،

اب اگر سلسلۃ التواریخ کے اس بیان کو مان لیا جائے، کہ راشٹ کوٹوں (یعنی بلھرا) کی سلطنت چین تک تھی، اور مولف کے نظریہ کے مطابق رہمی سے مراد برہما لیا جائے، تو پھر برہمی (رہمی) راجہ کی جنگ قنوج کے گوجروں سے کس طرح ممکن ہے، جسکو سلیمان بصری نے دو دفعہ لکھا ہے، کہ اسکی جنگ گوجروں سے ہوتی رہتی ہے، آج ہندوستان کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے ہے، اور ہر شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ

ہندوستان کا چین سے سرحدی اتصال اس مقام پر ہو سکتا ہے، جس کے ایک طرف مشرق شمال میں کامروپ کا ملک یعنی آسام ہوگا، اور دوسری طرف برہما (منی پور کی ریاست وغیرہ) کی سرزمین، اب اگر ایک طرف برہما (رہمی) دوسری طرف کامروپ اور درمیان کا علاقہ، راشٹر کوٹ کا (جو چین کی سرحد تک فرض کیا گیا ہے،) ہو، تو اب برہما اور گوجروں سے جنگ کہاں اور کس سرحد پر ہو گی، اسلئے تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ یہ مشرقی بنگال کی ایک مضبوط سلطنت تھی، جو بعد کو غالباً مغربی بنگال کی حکومت میں جذب ہوگئی، اور بقول مسٹر ہنبڈ ارکر راشٹر کوٹوں کے حالات اگر عربوں نے نہ لکھے ہوتے تو آثارِ قدیمہ سے بھی اس قدر حالات معلوم نہ ہوتے، اور ان کی شان و شوکت کا کسی کو علم بھی نہ ہوتا، اسی طرح سے رہمی کا ذکر عربوں ہی کی بدولت آج دنیا کو معلوم ہے، مگر چونکہ ان کا اس طرف آنا بہت کم ہوتا تھا، اسلئے ان کے تفصیلی حالات سے دنیا محروم ہے، بہت ممکن ہے، کہ آثار قدیمہ کا محکمہ جب اس طرف متوجہ ہو تو مزید معلومات حاصل ہو سکیں، وفوق ذی کل علم علیم،

اس کتاب کے آخر میں مؤلف نے بڑی محنت سے عربی اور انگریزی کتابوں سے ان مضامین کے خلاصے درج کئے ہیں، جن میں گوجروں کا ذکر ہے، الغرض اس کتاب میں گوجروں کے متعلق ہر قسم کے مواد جمع ہو گئے ہیں، جو آیندہ مورخ کے لئے مؤلف کے امتنان اور تشکر کا باعث ہوگا، کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ، اور مستند مواد کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے،

چینی مسلمان

مطبوعات جدیدہ

کارنامۂ اسلام، از جناب سید عنایت علی صاحب مسرور انھونوی، مسجد اکبر منڈی، بشیرت گنج، لکھنؤ، حجم ۲۰۲ صفحے، قیمت عار

یہ آنحضرت صلعم کی منظوم سیرت پاک ہے، جس میں ولادت سے وفات تک کے حالات مع دینی و تبلیغی مساعی کے بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے واقعات کی صحت کا التزام رکھا ہے، اور انہیں دلنشین پیرایہ بیان میں قلمبند کیا ہے،

میزان الجد، از جناب عنایت اللہ صاحب وزیر آبادی، گجرات، (پنجاب) حجم ۱۶ صفحے،

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اپنے دعاوی کے ثبوت میں آیات و احادیث کے ٹکڑوں سے حساب ابجد کے قاعدہ سے اعداد نکال کر بھی پیش کئے تھے، اس رسالہ میں الزامی جواب کے طور پر اسی قسم کے اعداد نکال کر ان کے دعاوی کے بطلان کے شواہد جمع کئے گئے ہیں، ایران کے بابی فرقے بلکہ ان سے پہلے باطنیہ فرقہ نے بھی قرآن و احادیث کے ظاہر الفاظ میں اپنی تائید نہ پاکر اس قسم کی صنعت سازیوں سے فائدہ اٹھایا ہے،

مغالطات مرزا، از جناب حافظ نور محمد خانصاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ۲۰ صفحے قیمت ۵ر

مرزا غلام احمد صاحب کی تحریروں میں مختلف بزرگوں، قوموں، فرقوں اور شخصوں کی شان میں سیکڑوں مغلظ اور غیر مہذب الفاظ اور جملے استعمال کئے گئے ہیں، اس رسالہ میں انہی کو یکجا کیا گیا ہے، ضرورت تھی، کہ حضرت عیسیٰؑ اور امام حسینؓ وغیرہ کی شان میں ان کے نا ملائم الفاظ استعمال کرنے کا جو جواب احمدی و قادیانی جماعتوں کی طرف سے دیا جاتا ہے، کہ وہ عیسائیوں کے "عیسیٰؑ" اور شیعوں کے "حسینؓ" کے متعلق کہے گئے ہیں، اس رسالہ کے مقدمہ میں اس تاویل کا پردہ بھی چاک کیا جاتا، اور پھر آنحضرت صلعم پر نعوذ باللہ مرزا صاحب

نے اپنی جو فضیلتیں دکھائی ہیں، اور اسکی ان جماعتوں کی طرف سے جو لایعنی تاویل کیجاتی ہے، اس کا جواب بھی مقدمہ میں دیدینا تھا،

گلدستۂ تعلیم اسلام، (پانچ حصے) مؤلفہ مولوی محمد عماد الدین انصاری فاضل دیوبند، ناشر کتب خانہ انصاریہ، بازار شیخان، جالندھر، حجم ۳۲، ۰۰، ۹۶، ۲۰، ۳۶ صفحات تقطیع چھوٹی، کاغذ لکھائی چھپائی بچوں کے لئے مناسب،

یہ رسالہ پانچ الگ الگ حصوں میں مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے تیار کیا گیا ہے، انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے مسلمان بچوں کے نصاب کیلئے رسالوں کے دو مفید سلسلے "اردو کا قاعدہ"، اور "اردو کی پہلی کتاب" اسی طرح اسکی پانچ کتابیں تھیں، پھر دینیات کا پہلا رسالہ اور ...... دوسرا رسالہ" کے ناموں سے ایک زمانہ میں رائج تھے، مصنف گلدستہ تعلیم اسلام نے اسکی تالیف میں انجمن کے ان دونوں سلسلۂ کتب کو سامنے رکھا، اور دونوں قسم کے معلومات زبان کے معیار کا لحاظ رکھکر ایک ایک ہی حصہ میں جمع کر دیا، "اردو کا قاعدہ" تو تقریباً حمایت اسلام کے قاعدہ کا مثنیٰ ہے، پھر ہر حصہ میں اسلام کے تاریخی حالات اور مذہبی عقائد و مسائل و اخلاقی تعلیمات وغیرہ جمع کر دئے گئے ہیں اسطرح یہ سلسلہ انجمن حمایت اسلام کے رسالوں سے بچوں کیلئے زیادہ مفید اور مختصر وقت میں مختلف نوعیت کے معلومات کے حاصل ہو جانیکے لحاظ سے زیادہ کار آمد ہے پہلے رسالہ "اردو قاعدہ" کے بعد اسکے چاروں حصوں کی ترتیب اسی طرز پر ہے امید ہے کہ یہ سلسلہ لوگوں میں زیادہ مقبول ہوگا،

معلم پشتو، ناشر مجلس تالیف پشتو، قندھار، (افغانستان) ۱۰۰ صفحے،

افغانستان کے اوس حصہ میں جس کا مرکز قندھار ہے، پشتو زبان کو ملکی و علمی زبان بنانے کی تحریک جاری ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے وہاں ایک علمی مجلس قائم کی گئی ہے، یہ رسالہ پشتو زبان کے قواعد صرف و نحو پر اسی مجلس کی طرف سے شائع کیا گیا ہے، رسالہ کی خصوصیت یہ ہے، کہ ملک کے مختلف ممتاز صاحب علم و اہل قلم نے نحو کے ایک ایک عنوان مثلاً اسم فعل، حرف، کو الگ الگ لے لیا ہے، اور ہر ایک

نے اپنے موضوع پر جدا جدا مضامین لکھے ہیں، اس طرح پشتو زبان کے یہ قواعد صرف ونحو ممتاز اہل علم کی مشتر[کہ]

کوششوں سے تیار کئے گئے ہیں،

معلم فارسی، حصہ اول و دوم از جناب منشی نذیر احمد صاحب فائق، مبارک منزل،

کانپور، حجم ۶۵، ۱۰۰، صفحات، قیمت ۳ر ۴ر

یہ بچّون کو فارسی پڑھانے کے لئے ابتدائی کتاب ہے، جس کے دو حصّوں میں صرف ونحو کے [...]

عام فہم، اور آسان قواعد مشق کے اسباق کے ساتھ لکھے گئے ہین، نیز فارسی اردو اور اردو فارسی [...]

لکھی ہیں، اور آخر میں الفاظ، محاورات اور واحد جمع کے لئے الفاظ کا مختصر ذخیرہ جمع کیا گیا ہے [...]

اور توجہ سے لکھی گئی ہے، تاہم مفرد الفاظ کے بعض معانی صحیح نہیں، مثلاً "خویش" کا ترجمہ "داماد" "خال" کا [...]

ماموں کے بجائے خالو، "سزا" کا ترجمہ "گوشمال" "شرمندی" کی فارسی "شماتت" اور "ریل" کا ترجمہ "کالسکۂ بخا[ر]"

کے بجائے "کالسکۂ بخاری" وغیرہ،

قرآن آموز، حصہ اول از جناب نذیر بن ابی سلمٰی، احاطہ شہزادہ محمد طاہر، لدھیانہ، حجم ۶۴ صفحے،

تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت ۴ر

یہ رسالہ مسلمان طلبہ کو بامعنی قرآن پڑھانے کیلئے لکھا گیا ہے، اور قواعد صرف ونحو کی مدد کے بغ[یر]

محض حروف والفاظ کے معانی کے ذریعہ آیات کے معنی لکھے ہیں، نیز چند چند سبقوں کے بعد ایک ایک سبق

میں قرآن مجید سے متعلق عام معلومات لکھے گئے ہین، اس طرز کے رسالہ کے مفید ہونے کا صحیح فیصلہ اس کے

تجربہ کے بعد کیا جا سکتا ہے، تاہم چند مشاہیر مثلاً نواب سر امین جنگ بہادر، مولانا کفایت اللہ، خواجہ حسن

نظامی صاحب اور مولوی ابو الاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن نے اس رسالہ کے مفید ہونے کی

توقع دلائی ہے،

"س"